جلد ۳۵

عدد ٦

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

فروری ۱۹۵۱ء

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۷۴ | فروری ۱۹۷۱ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۹۰ھ | عدد ۶

مغربی پاکستان		مشرقی پاکستان
چندہ سالانہ: آٹھ روپے	ماہنامہ ترجمان القرآن	ہوائی ڈاک: فی پرچہ ۹۰ پیسے سالانہ ۱۰ روپے
فی پرچہ: ۸۰ پیسے	۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور	عام ڈاک سے ۸۰ ″ ۸ روپے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اِشارات

جس طرح بیرونِ ملک اسلام دشمن طاقتیں پاکستان میں حالیہ انتخابات کے نتائج پر بڑی مسرور نظر آتی ہیں اور انہیں غلط فہمی سے دین پر لادینیت کی فتح تصور کرتی ہیں، بالکل اسی طرح اندرونِ ملک بھی ملتِ اسلامیہ اور دینِ حق کے دشمن گھی کے چراغ جلا رہے ہیں۔ وہ خوشی میں اس قدر بدمست ہو گئے ہیں کہ انہیں یہ احساس تک نہیں رہا کہ ان کی زبان اور قلم سے کیا کیا باتیں نکل رہی ہیں اور ان کے دلوں کا کینہ اور بغض کس طرح اُچھل اُچھل کر باہر آ رہا ہے۔ ان لوگوں میں یوں تو کئی قسم کے عناصر شامل ہیں لیکن ان میں سب سے پیش پیش قادیانی ہیں۔ وہ انتخابات میں پیپلز پارٹی کی کامیابی کو اپنے برحق ہونے کی زندہ نشانی تصور کرتے ہیں۔ چند روز ہوئے ربوہ کے سرکاری گزٹ کے مدیر کا ایک خط دفتر ترجمان القرآن میں موصول ہُوا ہم اس خط کو مدیر موصوف کی خواہش کے مطابق من وعن شائع کر رہے ہیں جس سے ان لوگوں کی ذہنی پرواز کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور یہ بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ ہمارے ہاں کے بہت سے دینداروں کے ساتھ جماعت اسلامی کی شکست پر خوش ہونے میں اور کون کون شریک ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم وعلیٰ عبدہ المسیح الموعود

مکرم جناب عبدالحمید صاحب صدیقی ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مَیں اکثر ترجمان القرآن میں آپ کے "اشارات" کا مطالعہ کرتا ہوں۔ چنانچہ شمارہ جنوری ۱۹۷۱ء کے اشارات بھی مَیں نے پڑھے ہیں۔ مَیں یہاں آپ کے آخری فقرہ کو پیش

کرتا ہوں جو حسبِ ذیل ہے:

"آگے نتائج اُس ذات پاک کے ہاتھ میں ہیں جو مالک الملک ہے اور جس نے فیصلے کے اختیارات اپنے ہی ہاتھ میں رکھے ہیں۔ بندوں کو سونپ نہیں دیئے ہیں۔"

مجھے یقین ہے کہ آپ نے یہ فقرہ محض رسماً نہیں لکھا۔ اگر میرا خیال درست ہے تو میں عرض کرتا ہوں کہ جماعت احمدیہ کے تعلق میں آپ "دو نشان" اب تک دیکھ چکے ہیں۔

(۱) پہلا نشان آپ نے ۱۹۵۳ء میں دیکھا تھا جب آٹھ مطالبوں کے ساتھ نانواں مطالبہ آپ نے احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت دلانے کا احرار کی تقلید میں ملا لیا تھا۔

نتیجہ۔ آپ کو سخت شکست ہوئی۔ یہاں تک کہ سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی پھانسی چڑھتے چڑھتے رحم کی بنا پر چھوڑ دیئے گئے۔

(۲) موجودہ انتخابات کے منشور میں آپ نے پھر وہی" احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی مد بھی شامل رکھی۔

نتیجہ:۔ آپ کی سیاسی وفات۔

الغرض نتائج اُس پاک ذات کے ہاتھ میں ہیں جو مالک الملک ہے۔ اس دفعہ آپ کی تیاریاں بہت زیادہ اور محکم تھیں۔ آپ کے طرفدار اخبارات میں سب کچھ محفوظ ہے۔ ایک بار ان کو پھر ملاحظہ فرمائیں۔

صحیح اور سعید روحوں کے لیے یہ "دو نشان" کافی سے زیادہ ہیں ورنہ صدیق کے لیے جس کے آپ نام لیوا ہیں ایک نشان کی بھی ضرورت نہیں تھی۔

مجھے یقین ہے کہ آپ یہ دو عظیم نشان دیکھ کر ضرور عبرت حاصل کریں گے اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ ہو۔ آمین۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہم کو بھی صحیح راستہ دکھائے۔ آمین

آپ کا ادنیٰ خیر خواہ

خاکسار روشن دین تنویر ایڈیٹر الفضل ۷۱/۱/۷

نوٹ: اگر آپ مناسب خیال فرمائیں تو اپنے اشارات میں میرے عریضہ پر تنقید کر سکتے ہیں بشرطیکہ آپ میرا خط مکمل شائع کریں۔ ورنہ نہیں۔

اس قسم کی غلط نشانیوں کا تذکرہ اور ان سے غلط نتائج اخذ کرنا قادیانی امت کے لیے کوئی نئی چیز نہیں یہ اس کا دلپسند مشغلہ ہے اور وہ اوّل روز سے اس نوعیت کے منطقی مغالطوں میں اُلجھ کر اس طرح کی غلط سلط باتیں کرنے کی عادی ہے۔ اُس کی اِس خاص "نشانی" سے تو پوری دنیائے اسلام واقف ہے کہ اس نے ہمیشہ حق کے مقابلے میں باطل قوتوں کا ساتھ دیا۔ جب تک انگریز اس ملک پر مسلط رہا قادیانی اس کے دعاگو رہے اور امّتِ مُسلمہ جب بھی اس کے ظلم و استبداد کا تختۂ مشق بنی تو انہوں نے نہ صرف اس ظالم کی کھلے طور پر تائید و حمایت کی بلکہ اسے اپنی فتح مندی سمجھ کر خوشی کے شادیانے بجائے۔ بغداد اور بیت المقدس پر انگریزوں کے قبضے اور جنگ میں ترکوں کی شکست پر جو دلی راحت اور فرحت انہیں محسوس ہوئی اور جس جوش کے ساتھ انہوں نے اپنی مسرت کا اظہار کیا اس سے کون مسلمان ناواقف ہے۔ وہ بھی اُن کی نظر میں اپنے برحق ہونے کی ایک نشانی تھی۔ اسی طرح کے دو تازہ "نشانات" کا آپ نے اب اپنے خط میں ذکر فرمایا ہے یقین کیجیے کہ ان دونوں نشانات کو آپ کی طرح ہم نے بھی اچھی طرح دیکھ لیا ہے اور انہیں ہم آپ کے برحق ہونے کے "نشانات" نہیں بلکہ اس بات کے نشانات سمجھتے ہیں کہ پاکستان میں آپ نے وہی مقام حاصل کر لیا ہے جو امریکہ میں یہودیوں کو حاصل ہے۔ اور آپ لوگوں کی سازشیں یہاں اسی طرح پھیل چکی ہیں جس طرح وہاں یہودیوں کی سازشیں پھیلی ہوئی ہیں۔ اگر یہودیوں کا اسرائیل کی ریاست قائم کر لینا اور تمام عرب ریاستوں کو تگنی کا ناچ نچانا اور امریکہ جیسی بڑی حکومت کے سر پر سوار ہو کر اس کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا اس بات کا ثبوت قرار دیا جا سکتا ہے کہ انہیں تائیدِ الٰہی حاصل ہے تو بلاشبہ آپ کا ۵۳ء میں غلام محمد و سکندر مرزا کے ساتھ اور اب پیپلز پارٹی کے ساتھ مل کر اپنی سازشوں میں کامیاب ہو جانا بھی تائیدِ الٰہی کا نشان سمجھا جا سکتا ہے۔ جن لوگوں کو پاکستان میں اُن پارٹیوں کا ساتھ دیتے ہوئے کوئی شرم محسوس نہیں ہوئی جن کے اندر ایک بہت بڑی تعداد خدا، رسول اور آخرت کا مذاق اڑانے والوں کی شامل ہے اور جو علانیہ یہاں سوشلسٹ نظام قائم کرنے کے ارادے ظاہر کرتی ہیں

اُن سے ہم یہ توقع نہیں رکھتے کہ وہ اپنی اِن کامیاب چالوں کو تائیدِ الٰہی کا نشان قرار دینے میں کوئی شرم محسوس کریں گے۔

جماعت اسلامی سے آپ لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ وہ آپ کو "غیر مسلم اقلیت" قرار دینا چاہتی ہے۔ لیکن آپ لوگ کبھی ٹھنڈے دل سے نہیں سوچتے کہ یہ آپ کے اپنے ہی مذہبی عقیدے کا لازمی نتیجہ ہے آپ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد ایک اور نبی کی نبوت کے قائل ہیں اور ہر اس شخص کو کافر قرار دیتے ہیں جو اس کی نبوت پر ایمان نہ لائے۔ یہ نئی نبوت ایک ایسی دیوار ہے جس نے آپ کو تمام دنیا کے اُن مسلمانوں سے الگ کر دیا ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنے والے ہر شخص کو کاذب اور اس پر ایمان لانے والوں کو کافر سمجھتے ہیں۔ یہ دیوار آپ کے عقیدے کی بنا پر بھی، اور مسلمانانِ عالم کے عقیدے کی بنا پر بھی، ایسی ناقابلِ عبور ہے کہ اس کی موجودگی میں آپ اور ہم ایک امت میں کسی طرح بھی جمع نہیں ہو سکتے۔ نبوت کے دعوے سے یہ نتیجہ آپ سے آپ نکلتا ہے کہ جو اس کو مانے وہ ایک اُمّت ہو، اور جو اس کو نہ مانے وہ دوسری اُمّت۔ اِس چیز کا دعویٰ لے کر جب ایک شخص اُٹھ چکا ہے تو لامحالہ اسے سچّا سمجھنے والوں کے نزدیک وہ سب لوگ کافر ہونے چاہییں جو اسے جھوٹا سمجھیں۔ اور اسی طرح اسے جھوٹا سمجھنے والوں کے نزدیک بھی وہ سب لوگ کافر ہونے چاہییں جو اسے سچا سمجھیں۔ اب جبکہ یہ صورتِ حال ایک امرِ واقعی کے طور پر موجود ہے تو آخر آپ لوگ اسے تسلیم کرنے سے گریز کیوں کرتے ہیں؟ آپ کو سیدھی طرح یہ مان لینا چاہیے کہ مرزا غلام احمد کی نبوت کے منکرین آپ کے عقیدے کی رُو سے غیر مسلم اکثریت ہیں، اور اس پر ایمان لانے والے نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے عقیدے کی رُو سے غیر مسلم اقلیت۔

اسی سلسلے میں، میں آپ سے یہ بھی دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آخر آپ کو جھوٹ بولنے میں غیر معمولی لذت کیوں محسوس ہوتی ہے؟ کیا آپ اس امر سے ناواقف ہیں کہ مولانا مودودی کا پھانسی کے تختے سے بچنا کسی رحم کی بنا پر نہیں تھا بلکہ کارسازِ حقیقی کی قدرت کا کرشمہ تھا؟ پوری دنیا کو یہ بات معلوم ہے کہ آپ لوگوں نے غلام محمد اور سکندر مرزا کے ساتھ مل کر کیا سازش کی تھی اور سب لوگ اس بات کو بھی اچھی طرح

جانتے ہیں کہ مولانا محترم نے بعض حضرات کے اصرار کے باوجود رحم کی اپیل کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ مجھے اب تک وہ الفاظ اور منظر یاد ہے جب مولانا نے پھانسی کی کوٹھڑی میں رحم کی اپیل داخل کرنے سے شدید اختلاف کرتے ہوئے اپنے صاحبزادے سے مخاطب ہو کر یوں فرمایا:

"بیٹے! مَیں ظالموں سے رحم کی اپیل نہیں کرنا چاہتا۔ انسان کی زندگی اور موت کے فیصلے زمین پر نہیں آسمانوں پر ہوتے ہیں۔ اگر میرے مالک کو مجھے بچانا ہے تو یہ لوگ اُلٹے بھی لٹک جائیں تو میرا بال تک بیکا نہیں کر سکتے۔ لیکن اگر وہاں سے میرے بلاوے کا حکم آگیا ہے تو پھر ساری دنیا مل کر بھی مجھے نہیں بچا سکتی۔"

پُورا ملک اس بات پر گواہ ہے کہ حکومت نے تمام دنیائے اسلام سے لعنت اور پھٹکار کی بارش ہونے کے بعد اس سزا کو از خود عمر قید کی سزا میں تبدیل کیا تھا، اور اس عمر قید سے رہائی بھی کسی کے رحم کی بنا پر نہیں ہوئی تھی بلکہ اِس قانونی نکتے کی بنا پر ہوئی تھی کہ تمیز الدین کیس میں فیڈرل کورٹ نے دستور ساز اسمبلی کے پاس کردہ اُن تمام قوانین کو غیر قانونی قرار دے دیا تھا جن پر گورنر جنرل کے دستخط نہیں ہوئے تھے۔ چونکہ انڈمنٹی ایکٹ (INDE MNITY-ACT) بھی ان قوانین میں شامل تھا اس لیے مارشل لا کی عدالت کا وہ فیصلہ بھی آپ سے آپ ختم ہو گیا جس کے تحت مولانا مودُودی صاحب کو سزا دی گئی تھی اور جس کی دی ہوئی سزا کو مارشل لا اُٹھنے کے بعد انڈمنٹی ایکٹ کی رُو سے برقرار رکھا گیا تھا۔ اب کیا آپ یہ بتائیں گے کہ آپ کو اس حقیقت کا علم نہ تھا، یا آپ نے جان بوجھ کر ایک مقتدر ہستی کے بارے میں یہ من گھڑت بات کہہ دی ہے کہ اسے رحم کی بنا پر چھوڑا گیا تھا؟

"آپ نے مجھے "صِدّیق" کی نسبت سے یاد فرمایا ہے، سو اس کے متعلق عرض ہے کہ میں اپنے آپ کو اِس مقدس ہستی کے خاکِ پا کے برابر بھی نہیں سمجھتا۔ مگر شاید یہ اُنہی کا فیضان ہے کہ مَیں وقت کے فتنوں سے متاثر نہیں ہوتا اور کسی فتنے کی ظاہری قوت مجھے مرعوب نہیں کرتی۔ مَیں اِن سارے فتنوں کو مانعینِ زکوٰۃ کے فتنے کی طرح دنیا پرستوں اور زر و مال کے پُجاریوں کی شورش خیال کرتا ہوں

انتخابات میں جماعت اسلامی کو مرکزی اور صوبائی ایوانوں میں حسبِ توقع نشستیں حاصل کرنے میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کے اسباب پر گذشتہ ترجمان القرآن میں تبصرہ کیا جاچکا ہے۔ اس ناکامی کے بارے میں مخالفوں، بہی خواہوں، سب نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ جہاں تک مخالفین کا تعلق ہے ان کے خیالات کا بھی ہم نے بغور مطالعہ کیا اور دیانتداری سے یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ اگر انہوں نے کوئی صحیح اور معقول بات کی ہو تو اسے قبول کرلیا جائے اور جماعت کے اربابِ حل وعقد کو اس کی طرف توجہ دلائی جائے۔ مگر اُن کی آراء سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کے لیے جماعت اسلامی اور اس کے محترم امیر کا وجود ہی گوارا نہیں۔ اس لیے ہم ان مخالفین کی آراء کو نظر انداز کرنے پر مجبور ہیں۔ مگر ہم محسوس کرتے ہیں کہ جماعت کے بعض خیر خواہوں کے دل میں بھی جماعت کی موجودہ ہیئت اور پالیسی کے بارے میں مختلف قسم کے شکوک و شبہات پائے جاتے ہیں اور وہ ان دونوں کے اندر تبدیلی کے آرزومند ہیں۔ ہم ان کے ان مشوروں اور ان کے نیک جذبات کی قدر کرتے ہیں اور انہیں یقین دلاتے ہیں کہ ہم کوئی ضدی اور ہٹ دھرم لوگ نہیں ہیں کہ جان بوجھ کر ایک غلط راہ پر چلنے پر مُصر ہوں اور بھلائی کی بات سننے اور قبول کرنے میں ہمیں کوئی تامّل ہو۔ ایک خادمِ دین جماعت جو محض اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے اپنے رسائل کی حد تک کوشش کر رہی ہے اسے آخر صحیح بات اور نیک مشورہ قبول کرنے میں کیا عذر ہوسکتا ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ خیر خواہی اور محبت سے پیش کیے جانے والا ہر مشورہ سو فیصد صحیح بھی ہو۔ ہمیں امید ہے کہ جن اچھے جذبات کے ساتھ انہوں نے اپنے قیمتی مشورے دیئے ہیں انہی جذبات کے ساتھ وہ ہماری گزارشات پر بھی غور کریں گے۔

جماعت اسلامی کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ جسے ہمارے اکثر و بیشتر خیر خواہ نظر انداز کر رہے ہیں وہ بین الاقوامی حالات کی ناسازگاری ہے۔ وہ خارجی قوتیں جو اس وقت اسلام اور خصوصاً احیاءِ اسلام کی ہر اُبھرنے والی تحریک کے خلاف دنیا بھر میں کارفرما ہیں ان کی وسعت اور اثر آفرینی کا ٹھیک ٹھیک طور پر اندازہ نہیں کیا جاتا۔ پوری دنیا اگرچہ اس وقت دو کیمپوں میں بٹی ہوئی ہے مگر عملاً ان دونوں کیمپوں میں ایک ہی نظام کے تسلط اور حفظ و بقا کے لیے سپاہ تیار کی جارہی ہے اور وہ ہے نظامِ مادیت

اس نظام کے افکار و نظریات کی فنی پیچیدگیوں کو چھوڑ دیا جائے تو اسے مختصر طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ نظامِ مادیت ایک ایسا ہمہ گیر نظامِ حیات ہے جس میں عمل کے محرکات، خوب و ناخوب کے پیمانوں اور مقصد و منہاج کا تعین سراسر دنیوی اور مادی سود و زیاں کے مطابق کیا جاتا ہے۔ اس نظام میں جو چیز یا نظریہ اس بنیاد سے بے تعلق ہے وہ بالکل غیر ضروری اور بے اثر ہے۔ یہ لازمی نہیں کہ اس نظام کے ماننے والے منکرِ خدا، دہریے اور کافر ہی ہوں، مگر یہ بات ضروری ہے کہ وہ اجتماعی زندگی پر ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کی پرچھائیں تک پڑنے نہیں دیتے۔ اگر ان پر ایمانیات کا کوئی معمولی اثر ہوتا بھی ہے تو وہ اُن کے دل کے کسی گوشے میں ہوتا ہے، ان کی حیاتِ اجتماعی دینی اور مذہبی اثرات سے یکسر خالی رہتی ہے۔

سرمایہ دارانہ جمہوریت یا اجتماعیت پسندانہ سرمایہ داری میں جسے لوگ اشتراکیت کے نام سے موسوم کرتے ہیں، روح، مزاج اور مقصد کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ فرق جو کچھ ہے وہ صرف طریقِ کار کا ہے۔ جس مقصد کو سرمایہ دارانہ نظام آہستہ آہستہ انفرادی تگ و دو اور منافع کے محرکات سے آگے بڑھاتا ہے۔ اسی مقصد کو اشتراکیت بڑی برق رفتاری سے اجتماعی حکم بندیوں اور اجتماعی مفادات کے خوش کن وعدوں کے فریب دے کر حاصل کرتی ہے۔ یہ مادی نظام کہیں اشتراکیت کے روپ میں اور کہیں جمہوریت کے نام پر اس وقت پوری دنیا پر مسلط ہے۔ یہ وقت کا غالب نظام ہے اور اس نظام کا اس وقت صرف سیاسی تسلط ہی قائم نہیں بلکہ اس نظام کے غلبے کے ساتھ دنیا میں جو افکار و نظریات پروان چڑھے ہیں، جس تہذیب و تمدن کو بالادستی حاصل ہوئی ہے، جن اخلاقی معیارات کا عام چلن ہوا ہے، انہیں بھی آج پوری دنیا میں تفوق و برتری حاصل ہے۔ ایک انسان جب سانس لیتا ہے تو اس نظام کے جراثیم خود بخود اس کے حلق میں اُتر جاتے ہیں۔ وہ جب نگاہ اٹھا کر اپنے گرد و پیش دیکھتا ہے تو اس نظام کے مختلف مناظر اس کی آنکھوں کو خیرہ کرنے کے لیے ہر طرف موجود ہوتے ہیں۔ وہ جب کان کھول کر آواز سننا چاہتا ہے تو اس نظام کی گونج ہی اُسے سنائی دیتی ہے۔ آخر غور کریں کہ عقلیت پسندی کی یہ مختلف تحریکات فلسفہ، نفسیات اور ادب کے موجودہ رجحانات، قانون و اخلاق کے مروجہ نظریات، معیشت، معاشرت اور

سیاست کے مختلف تصورات اور ان تصورات کو بروئے کار لانے کی مختلف عملی تدبیریں کس نظامِ حیات کو تقویت بہم پہنچاتی ہیں؟ اور ان افکار و نظریات نے عوام خصوصاً پڑھے لکھے طبقوں کے دل و دماغ کو کس حد تک مرعوب کر رکھا ہے؟ ان باطل تصورات کے سیلِ بے پناہ نے صرف دنیائے مغرب ہی میں دینی اقدار کو برباد نہیں کیا بلکہ پورے عالمِ اسلام کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ دنیا کا کوئی ایک ملک بھی ایسا نہیں جو باطل کے اس سیلاب کی زد سے محفوظ ہو۔ دوسرے ممالک کو تو ایک طرف رہنے دیجیے، خود وہ ممالک جن کی سربراہی مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے اور جہاں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب اسی اور نوے فیصد ہے وہاں بھی مادی نظامِ حیات کی عملداری اپنی ساری گمراہیوں کے ساتھ قائم ہے۔

اب جو تحریکیں اس سیلاب کو روکنے کے لیے کام کر رہی ہیں ان کی بے بسی ملاحظہ فرمائیں۔ ایک طرف تو انہیں وقت کے غالب افکار و رجحانات اور تصورات کے خلاف جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ دوسری طرف اس جدوجہد کے لیے انہیں جس قدر وسائل درکار ہوتے ہیں اُن کا عشرِ عشیر تو کیا ان کا کروڑواں حصہ بھی فراہم نہیں ہوتا۔ پھر ان کے تسلط کی وجہ سے لوگوں کے ذہنوں میں جو مرعوبیت بلکہ مغلوبیت پائی جاتی ہے اُس سے بھی انہیں طرح طرح کی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ اِس پر مزید یہ کہ اس باطل نظام نے اپنی عملداری کے لیے زیرِ زمین بھی اور بالائے زمین بھی، سازشوں کا ایک نہایت ہی وسیع اور پیچیدہ نظم قائم کر رکھا ہے جس کے لیے ملک کے اندر بھی بہت سی طاقتیں کام کر رہی ہیں اور ملک کے باہر سے عالمی طاقتیں بھی ان کو تقویت پہنچا رہی ہیں۔ یہ تحریکات تعداد میں اس قدر زیادہ اور اپنے پروگراموں کے اعتبار سے اس قدر وسیع اور طریقہائے کار کے لحاظ سے اتنی متنوع اور اثرات کے اعتبار سے اتنی ہمہ گیر ہیں کہ اسلامی تحریکوں کے لیے ان کا مقابلہ عالمِ اسباب میں جوئے شیر لانے سے کچھ کم دشوار نہیں ہے۔ جونہی کوئی دینی تحریک معرضِ وجود میں آتی ہے اسی وقت تمام اسلام دشمن تحریکیں مل کر اسے برباد کرنے کے لیے اپنے اپنے پروگرام لے کر میدان میں آجاتی ہیں اور ہر طرف سے اس پر یلغار کرتی ہیں۔ آپ سوچیے کہ مصر میں اخوان المسلمین کا جو حشر ہوا ہے اور اس کے خلاف دنیا میں حقارت و نفرت کے جو جذبات پھیلے ہیں اور اس کی بربادی پر دنیا کے مختلف ممالک اور طبقوں میں

خوشی کے جو شادیانے بجے ہیں کیا وہ محض مصر کے چند حکمرانوں کی کوششوں کے نتائج ہیں ؟

اسی پس منظر میں ذرا جماعتِ اسلامی کی مشکلات کا بھی اندازہ لگا لیجیے۔ ڈھائی ہزار ارکان پر مشتمل ایک چھوٹی سی جماعت، جس کے ہمدردوں کی تعداد چند لاکھ نفوس سے زیادہ نہیں ہے جس کے وسائل انتہائی قلیل ہیں اور جس کی مادّی قوت نہایت ہی کم ہے، اس کے پیچھے ایک دنیا ہاتھ دھو کر پڑی ہوئی ہے۔ جن لوگوں نے امریکہ، انگلستان، روس اور فرانس کے اخبارات، ریڈیو اور ٹیلیویژن پر انتخابات کے متعلق تبصرے پڑھے یا سُنے ہیں انہیں اس بات کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ جماعت کی شکست پر ان ممالک نے کس قدر اطمینان کا سانس لیا ہے۔ پھر اندرونِ ملک اس جماعت سے جو نارو اسلوک کیا جاتا رہا ہے وہ بھی سب کے سامنے ہے پچھلے چوبیس سال میں ہمارے ہاں مختلف قسم کے رجحانات رکھنے والی حکومتیں قائم ہوئی ہیں۔ ایک وقت تھا کہ ہمارے حکمران امریکہ بہادر سے ہر معاملے میں صلاح مشورہ لیا کرتے تھے اور اس ملک کی داخلی اور خارجی پالیسیوں کی تشکیل میں اس کا اچھا خاصا دخل تھا۔ اس دور میں بھی جماعت اسلامی باقاعدہ موردِ الزام رہی اور اس پر مسلسل عتاب نازل ہوتا رہا۔ پھر رجحانات کے اندر تبدیلی پیدا ہوئی اور اشتراکی ممالک خصوصاً روس اور چین کا اثر بڑھا مگر جماعت اسلامی کے معاملے میں کوئی تغیر رونما نہ ہوا، اسے برابر ظلم و ستم ہی کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔ جب بُری بھلی جمہوریت تھی، اس وقت بھی حکومت کی طاقتیں اسے دبانے اور مٹانے پر صرف ہوتی رہیں، اور جب آمریت آئی تو اس نے بھی سارا زور اس کے خلاف لگا دیا۔ اس پوری مدت میں ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا ہے جب حکومت کی پالیسی میں اس کے لیے کوئی نرمی پیدا ہوئی ہو۔

حکومت کی سطح سے نیچے اُتر کر دیکھیے تو جماعت کو کبھی اطمینان اور چین سے کام کرنے کا موقع نہ دیا گیا۔ ملک میں جتنے لادین اور گمراہ عناصر تھے سب نے متفق ہو کر اسے تباہ کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا، اور یہ عجیب بات ہے کہ ان کے ہر وار پر نہ صرف اندرونِ ملک بلکہ باہر کے ممالک میں بھی تعریف و توصیف کے ڈونگرے برسائے جاتے رہے۔ بین الاقوامی پریس ان اسلام دشمن عناصر کے

کارنامے اُچھال اُچھال کر سامنے لاتا رہا اور دنیا کو یہ تاثّر دینے کی کوشش کرتا رہا کہ جماعت تاریک خیال اور تنگ نظر اور رجعت پسند افراد کا ایک ٹولہ ہے جو مذہبی تعصبات اُبھار کر پاکستان میں تھیاکریسی قائم کرنا چاہتا ہے جس سے زیادہ قابلِ نفرت کوئی چیز اہلِ مغرب اور اشتراکی دنیا کی نگاہ میں نہیں ہے۔ پھر ان عناصر نے بڑی عیاری کے ساتھ جماعت اسلامی کی عداوت و مخالفت کے محاذ پر علماء کے ایک نہایت مُنہ پھٹ طبقے کو لا کھڑا کیا اور ان کے مزاج کی مناسبت سے اُنہیں ایک ایسے مورچے پر یلغار کرنے کے لیے متعین کیا جہاں سے جماعت کی دینی حیثیت کو، جو اس کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے، زبردست نقصان پہنچایا جا سکتا ہو۔ چنانچہ یہ طبقہ نتائج سے یکسر غافل اور خوفِ خدا اور فکرِ آخرت سے بالکل فارغ ہو کر اس خادمِ دین جماعت کو بدنام کرنے میں منہمک ہو گیا اور اس کام میں اس کے انہماک کا یہ عالم ہے کہ اسے جماعت اسلامی اور اس کے امیر کے خلاف کوئی جھوٹ بولنے اور کوئی بہتان لگانے اور کوئی تہذیب و شرافت سے گری ہوئی زبان استعمال کرنے میں ذرا تامّل نہیں ہے۔ اس کو دنیا میں جماعت اسلامی کے سوا کوئی فتنہ نظر نہیں آتا۔ حتیٰ کہ اس بے دین طبقے کے ہاتھوں خوب چوٹیں کھا لینے کے باوجود علماء کے اس طبقے کی آنکھیں نہیں کھُلیں اور وہ اب بھی جماعت کے خلاف تن، من، دھن سے مصروفِ عمل ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا جماعت اسلامی کے خلاف اس قدر منظم اور وسیع پیمانے پر کوشش محض ملکی وسائل کے بل بوتے پر کی جا سکتی ہے؟ ہمیں یہ بات تسلیم ہے کہ دیندار طبقے جو اس "کارِ خیر" میں مصروف ہیں ان کے ہر فرد کو شاید اس بات کا صحیح شعور نہ ہو کہ وہ کن چھپے ہوئے ہاتھوں کے اشارے پر بالکل نادانستہ طور پر یہ سب کچھ کارروائیاں کر رہا ہے مگر بہرحال اس کا فائدہ تو دشمنِ دین عناصر کو پہنچ ہی رہا ہے اور باطل کی قوت تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ اتنے ہمہ گیر طوفان کا مقابلہ آخر ایک کمزور سی جماعت کہاں تک کر سکتی ہے؟

پھر اس معاملہ کا ایک دوسرا پہلو بھی قابلِ غور ہے۔ انسانوں کی عظیم اکثریت کسی نظریئے کو خواہ وہ کتنا ہی صحیح اور برحق ہو اس وقت تک قبول کرنے میں تامل کرتی ہے جب تک کہ وہ عالمِ واقعات میں پھُل

نتائج پیدا نہیں کر دیتا۔ مجرد حقائق کو آغاز میں ماننے والے ہمیشہ قلیل تعداد میں ہوتے ہیں۔ عوام اُن کی طرف اُس وقت لپکتے ہیں جب وہ حقائق پیکرِ محسوس میں ڈھل کر انسانوں کے سامنے نمودار ہونے لگیں اور ان کے اندر اپنی فلاح و بہبود کے آثار انہیں نظر آنے لگیں۔ اگر پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے ساتھ ہی یہاں اسلامی نظام کے قیام کی پُورے خلوصِ نیت سے کوششیں شروع ہو جاتیں اور ان کے نتیجے میں یہاں فی الحقیقت یہ نظام قائم ہو جاتا اور عوام زندگی کے ہر شعبے میں اس کی برکات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے اور اس کی رحمتوں کو اپنی روح کے اندر پوری طرح محسوس کر سکتے تو پھر اس بات کی بجا طور پر توقع کی جا سکتی تھی کہ یہ پُورا ملک باطل نظام کے خلاف ایک زبردست محاذ بن جاتا اور یہاں کا ہر فرد دوسرے نظاموں کے خلاف ٹکرانے اور انھیں برباد کرنے کے لیے بیتاب ہوتا۔ مگر یہاں عملاً جو کچھ ہوا ہے وہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس خطۂ پاک میں جگہ جگہ اسلام کو برباد کرنے کے لیے کفر کے مورچے قائم کیے جاتے رہے ہیں۔ آپ تعلیمی درسگاہوں، نشریاتی اداروں اور ابلاغ کے دوسرے ذرائع کا جائزہ لیجیے اور دیکھیے کہ ان سب کا مقصود کیا ہے؟ ان کی تربیت سے حق کے سپاہی تیار ہوتے ہیں یا اُن کے فیض سے باطل کے علمبرداروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے؟

ان سب حالات کا وزن ایک پلڑے میں ڈالیے اور دوسرے پلڑے میں جماعت اسلامی کی معمولی قوت کو ڈال کر پھر انصاف سے اندازہ کیجیے کہ اس میں جماعت کی داخلی کمزوریوں کا کتنا دخل ہے اور جس نہج پر آج اس کے کام اور نظام میں تبدیلیاں تجویز کی جا رہی ہیں کیا ان سے بہتر نتائج برآمد ہونے کی کوئی توقع ہو سکتی ہے؟ انقلاب بذاتِ خود مشکل کام ہے، مگر خاص طور پر اسلامی انقلاب تو ایک نہایت ہی صبر آزما کام ہے جسے برپا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام مبعوث فرمائے۔ اسلامی نظامِ حیات مادّی نظام کے بالکل برعکس ایک دوسرا نظام ہے۔ مادّی نظام میں اگر عمل کے محرکات مادّی منافع ہیں تو یہاں عمل کا واحد محرک رضائے الٰہی ہے۔ اُس نظام میں اگر فلاح و کامرانی کا تصور مادّی آسائش و آرام سے عبارت ہے تو اسلامی نظامِ حیات میں فلاح کا تصور آخرت کی فلاح سے وابستہ ہے۔ مادّی نظام میں اگر اخلاق دنیوی مفادات کے تابع ہے تو اسلامی نظام میں دنیوی مفادات اخلاق کے تابع ہیں۔ مادی نظام کا سارا تانا بانا

مادی اقدار سے تیار کیا گیا ہے جبکہ اس کے برعکس اسلامی نظام اوّل تا آخر روحانی اور اخلاقی اقدار پر قائم ہے۔ موجودہ دور میں مادی نظام کو اس وقت پوری دنیا میں تسلّط حاصل ہے۔ اس سے عوام کی توجہ ہٹا کر ایک ایسے نظام کی طرف مبذول کروانا اور پھر اُس کے بارے میں ان کے دل و دماغ میں ایسی محبت پیدا کرنا کہ وہ خود اس کے علمبردار بن کر اس کی سربلندی کے لیے دیوانہ وار آگے بڑھنے پر آمادہ ہو جائیں، بڑا کٹھن کام ہے۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان تو کوئی نوعی فرق نہیں بلکہ یہ دونوں ایک ہی نہج کے ارتقاء کی دو مختلف منازل ہیں، اور جہاں تک تہذیب کا تعلق ہے، دونوں میں وہ بالکل مشترک ہے، پھر بھی ان دونوں نظاموں کے درمیان اِس تھوڑے سے فاصلے کو طے کرنے کے لیے اندازہ لگائیں کہ اشتراکیوں کو جان و مال کی کس قدر زیادہ قربانیاں کرنی پڑی ہیں۔ مگر ہم جس نظام کو برپا کرنے کا عزم رکھتے ہیں اس نظام اور مروجہ نظاموں کے درمیان بے انتہا فاصلہ ہے۔ ان میں کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔ ان کے مقاصد ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان کے مزاج ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ ان وسیع اختلافات کے ہوتے ہوئے اسباب کی دنیا میں آسانی کے ساتھ کسی غیر معمولی کامیابی کی توقع کرنا حالات کی سنگینی کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہے۔

ممکن ہے کہ حالات کی جو تصویر کشی ہم نے کی ہے اُسے دیکھتے ہوئے کسی شخص کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ ان حالات میں اسلامی انقلاب برپا ہونے کا تو پھر سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ ہماری ان گزارشات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط ہے۔ اگر کچھ اسباب ہمارے خلاف کام کر رہے ہیں اور ہم اپنے دوستوں اور بہی خواہوں کو انہیں پیشِ نظر رکھنے کا مشورہ دے رہے ہیں تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ہم انہیں لازمی طور پر کسی ہرنے والی بازی کے لیے تیار کر رہے ہیں۔ انہیں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ حق بذاتِ خود ایک بہت بڑی قوت ہے خواہ لوگ اسے تسلیم کریں یا اس سے انکار کریں۔ اس لیے ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ دنیا میں حق کا علمبردار بن کر زندہ رہے اور حق کی سربلندی کے لیے جان دے۔ یہی وہ فرض ہے جس کی ادائیگی اُمّتِ وَسَط کی حیثیت سے ہم پر عائد ہوتی ہے۔ ہم

سخت خسارے کا سودا کریں گے اگر حالات کی ناساعدت کی وجہ سے اپنے اصل فرض سے غافل ہو جائیں اور صحیح راستے کو چھوڑ کر غلط راستوں پر چل پڑیں۔ دنیا میں کتنے ایسے انبیاء اور صلحا گذرے ہیں جو کوشش کے باوجود حق و صداقت کو اپنے دور کی غالب قوت نہ بنا سکے۔ کیا ان مقدس ہستیوں کی کوششوں کو ناکام کہا جا سکتا ہے؟ نیکی اور بھلائی کی ہر کوشش کامیاب ہی ہے بشرطیکہ اسے خلوص نیت کے ساتھ کیا جائے۔ یہ کوششیں ہر طور بارآور ہوتی ہیں اور کبھی ناکام نہیں ہوتیں۔ آج دنیا میں شرافت، نیکی اور انصاف کی جو مختلف اقدار قندیلوں کی طرح روشن ہیں وہ سب حق کے علمبرداروں کی تگ و دو ہی کی رہین منت ہیں۔ اگر یہ سارے لوگ حالات کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے حق و صداقت کی شمع ہاتھ سے چھوڑ دیتے اور ان کی جگہ تاریکیاں پھیلنے پر راضی ہو کر بیٹھ جاتے تو کیا انسانیت کہیں بھی روشنی کی کرن پا سکتی تھی؟

اس سلسلے میں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ باطل بلا شبہ دنیا میں غالب قوت کی حیثیت سے وقتاً فوقتاً اُبھرتا رہتا ہے، مگر اس کے مزاج میں چونکہ تخریب کا عنصر مُضمر ہوتا ہے اس لیے ہر باطل کی قوت خود بخود ٹوٹتی رہتی ہے، اور اس رخنے سے دوسری قوتوں کے اُبھرنے کا راستہ نکل آتا ہے پہلی جنگ عظیم نے دنیا کی باطل قوتوں کو سخت دھچکا لگایا اور دوسری جنگ عظیم نے انہیں ادھ موا کر کے رکھ دیا۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے مشرقی ممالک اُن کی گرفت سے آزاد ہو گئے، حالانکہ ان میں سے کسی ایک میں بھی یہ قوت موجود نہ تھی کہ وہ اپنے وسائل کے بل بوتے پر اُن کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا۔ سیاسی قوت کے علاوہ نظام باطل کی اخلاقی اور معاشرتی قوت بھی ایک حد تک پہنچنے کے بعد رو بہ زوال ہو جاتی ہے۔ مثلاً امریکہ، برطانیہ اور فرانس میں آزادی کے نام پر جرائم کی کثرت، اخلاقی بے راہ روی اور خاندانی انتشار نے جو ہولناک صورت حال پیدا کی ہے اُس نے ان ممالک کے رہنے والوں کو اچھا خاصا جھنجھوڑا ہے۔ اسی طرح اشتراکی ممالک خصوصاً روس میں منصوبہ بندی نے اجتماعی جکڑ بندیوں کا جو ظالمانہ نظام قائم کیا ہے اس نے خود اس نظام کے علمبرداروں میں اس کے خلاف جذبۂ نفرت پیدا کر دیا ہے جو لاوے کی صورت میں اندر ہی اندر اُبل رہا ہے اور پھوٹ نکلنے کے لیے بالکل تیار معلوم ہوتا ہے۔ ایسے ہی حالات ہوتے ہیں جب ایک قائم شدہ

غلط نظام میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں اور کسی تبدیلی کے لیے راستہ نکلتا ہے۔ اگر اس وقت کسی صحت مند تبدیلی کے لیے کام کرنے والے موجود نہ ہوں تو اس راستہ سے کوئی اور غلط تبدیلی آجاتی ہے۔ ان تمام امکانی مواقع کو نظر انداز کر کے حق کے چراغ جلانے والے مایوس ہو کر بیٹھے رہیں، یا شکست کھا کر باطل کی صفوں میں جا شامل ہوں تو انسانیت کو روشنی آخر کہاں سے ملے گی۔

بلاشبہ مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ حق کو دنیا میں غالب کریں، لیکن اگر اس کی کوشش کرنے کے باوجود وہ ایسا نہ کر سکیں تو کیا پھر انہیں باطل کا پرچم بلند کرنے کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے؟ حق تو ایک روشنی ہے جس سے انسانیت راہِ ہدایت پاتی ہے۔ انسان اس روشنی کا ہر لمحہ محتاج ہے مگر اس کی ضرورت اسے سب سے زیادہ اس وقت محسوس ہوتی ہے جب ہر طرف گھٹاٹوپ اندھیرا چھا رہا ہو اور کہیں سے بھی نور کی کرن دکھائی نہ دیتی ہو۔ آج جب مادی نظامِ حیات نے پوری دنیا کو ایک وسیع ظلمت کدہ بنا رکھا ہے اور باطل کی خوفناک آندھیاں ہر طرف یورش کر رہی ہیں ان حالات میں حق و صداقت کے چراغ ہاتھ میں لے کر ان طوفانوں میں محض کھڑے رہنا بھی دین کی کوئی کم خدمت نہیں ہے کچھ عجب نہیں کہ یہ چراغ اگر جلتا رہے تو باطل کی تاریکیوں میں بھٹکنے والے اس روشنی کو موجود پا کر اس کی طرف خود رجوع کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

بعض مخلصین نے ان انتخابات کے نتائج سے دل برداشتہ ہو کر یہ مشورہ دیا ہے کہ جماعت کو عوامی بنانے کے لیے اس کی شرائطِ رکنیت کو بہت آسان کر دیا جائے۔ ہم اس مشورہ کو بھی صحیح نہیں سمجھتے۔ جماعت اسلامی کے اندر بلاشبہ غیر معمولی قوتِ جاذبہ پیدا ہونی چاہیے اور اس کے لیے جو تدابیر بھی مؤثر ہو سکتی ہیں انہیں بروئے کار لانا چاہیے لیکن اگر رکنیت کی موجودہ کم سے کم شرائط کو آسان کر کے جماعت کو عوامی بنانے کی کوشش کی گئی تو اس سے جماعت کی امتیازی حیثیت ختم ہو جائے گی اور وہ بھی دوسری سیاسی جماعتوں کی طرح محض ایک سیاسی جماعت بن کر رہ جائے گی۔ اس وقت رکنیت کی جو شرائط موجود ہیں ان کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ وہ کم سے کم شرائط ہیں جن کا اسلام کسی مسلمان سے مطالبہ کرتا ہے۔ کیا فرائض کی ادائیگی کا التزام اور منکر سے اجتناب کسی مسلمان کے لیے ناقابلِ برداشت بوجھ ہے؟ خصوصاً اس مسلمان کے لیے جو دنیا میں

دینِ حق کو غالب کرنے کا عزم رکھتا ہو؟ اس وقت معاشرے کی عام حالت یہ ہوگئی ہے کہ مسلمانوں کے اندر اسلامی احکام کی اطاعت کا جذبہ بڑی تیزی کے ساتھ سرد پڑتا جا رہا ہے۔ نماز اور روزہ اسلام کے اہم ارکان ہیں۔ ان کے بارے میں عام بے پروائی بلکہ مجرمانہ غفلت کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ احکامِ دین تو ایک طرف رہے عقائد تک کے بارے میں لوگ بعض اوقات ایسی لغو اور بیہودہ باتیں کرنے لگتے ہیں جنہیں آج سے چند سال پیشتر مسلم معاشرے میں کوئی شخص زبان پر لانے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ ان حالات میں اگر جماعت اپنے ارکان کی تعداد بڑھانے اور اپنے آپ کو سیاسی اعتبار سے وسیع کرنے کے لیے شرائطِ رکنیت کو زیادہ آسان بنا دے تو کیا جماعت احیائے اسلام کے لیے کوئی مؤثر خدمت سرانجام دے سکے گی؟ اگر ہمارا مقصود و مطلوب محض سیاسی اقتدار ہے تو پھر بلاشبہ ہمیں ان پابندیوں کو جلد از جلد ختم کر کے تعداد میں اضافہ کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔ لیکن اگر ہمیں اللہ کے دین کو سربلند کرنے کے لیے مردانِ کار درکار ہیں تو پھر ان پابندیوں کو سخت کرنے کی ضرورت ہے۔

اس ضمن میں بعض حضرات یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ چونکہ کمیونسٹ پارٹی اپنے رکنیت کے دائرے کو محدود رکھتی ہے اس لیے اسے انگلستان میں قوت رکھنے کے باوجود انتخابات میں کبھی کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ لیکن جماعت اسلامی کو کمیونسٹ پارٹی پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ ان دونوں جماعتوں میں کوئی چیز بھی مشترک نہیں۔ کمیونسٹ پارٹی کا دائرۂ رکنیت اس لیے محدود ہے کہ اس کی سرگرمیوں کا بیشتر حصہ زیرِ زمین ہوتا ہے۔ اُس کا پروگرام چونکہ اقلیت کو اکثریت پر بالجبر اس کی مرضی کے علی الرغم مسلط کرنا اور آمریت قائم کرنا ہے اس لیے اس کے قابلِ اعتماد کارکن ہمیشہ تھوڑے سے ہی ہوتے ہیں تاکہ وہ چھپ کر تخریبی سرگرمیوں کو بڑے مؤثر طریق سے سرانجام دے سکیں اور ان کی کوئی کارروائی عوام کے سامنے نہ آئے۔ عوام کے دل و دماغ اور ان کے حقوق پر شب خون مارنے کے لیے چھوٹے چھوٹے دستے ہی مفید اور کارآمد ہو سکتے ہیں۔ اس کام کو کوئی بڑا لشکر کامیابی کے ساتھ سرانجام نہیں دے سکتا۔

جماعت اسلامی کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہاں ہر کام دن کے اُجالے میں ہوتا ہے، تاریکی میں عوام کی نگاہوں سے چھپ کر نہیں کیا جاتا۔ ہم تو دل و جان سے ہر شخص کو اُسی دلسوزی کے ساتھ اس

میں شریک ہونے کی دعوت دیتے ہیں جس دردمندی اور دلسوزی کے ساتھ کوئی پابندِ صوم وصلوٰۃ مسلمان اپنے دوسرے بھائی کو جو ان ارکان کا تارک ہے ان کی پابندی کی دعوت دیتا ہے۔ البتہ ہم بالکل فطری طور پر اس سے یہ تقاضا کرنے میں حق بجانب ہیں کہ جس طرح نماز میں شریک ہونے سے پہلے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ طہارت کے کم سے کم تقاضے پورے کرے تاکہ اسکی نماز ادا ہو جائے بالکل اسی طرح ہم دینِ حق کو دنیا میں سربلند کرنے کا عزم لیکر اٹھنے والوں سے یہ مطالبہ ضرور کرتے ہیں کہ وہ جس دین کو دنیا پر غالب کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اسے پہلے اپنی انفرادی زندگی میں اپنانے کی کوشش کریں۔ جو لوگ اپنی انفرادی زندگی میں دین کے کم سے کم تقاضے پورے کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتے اُن سے کسی دینی تحریک کو کوئی زیادہ قوت فراہم نہیں ہو سکتی۔

یہ رائے بھی ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کی محدود رکنیت کی وجہ سے چونکہ اُسے انتخابات میں کبھی کامیابی نصیب نہیں ہوتی، اس لیے جماعت کو بھی انتخابات میں کامیابی کے لیے یہ طرزِ عمل ترک کر دینا چاہیے۔ کمیونزم کی انتخابات میں ناکامی کی وجہ، جیسے ہم پہلے گذارش کر چکے ہیں، اس کا ایک خاص مزاج اور کام کی ایک خاص ٹیکنیک ہے کمیونزم کا مزاج ہی ایسا ہے کہ اُسے کبھی بھی جمہوریت کی فضا راس نہیں آتی۔ اس لیے وہ انقلاب کے جمہوری طریقے سے سخت گھبراتا ہے اور اگر وہ اس طریقہ سے کامیاب ہو بھی جائے تو جمہوری نظام میں ان عزائم کی تکمیل نہیں کر سکتا جو اس کے پیشِ نظر ہوتے ہیں، حتیٰ کہ جمہوریت کی راہ سے آنیوالا کمیونزم اسی راہ سے رخصت بھی ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس کا من بھاتا طریقِ کار یہ ہے کہ قوم کے اندر بددلی پھیلا کر اور ملک میں ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع کر کے کسی نہ کسی طرح موقع پا کر اقتدار پر قبضہ کر لیا جائے اور پھر ایک مختصر سے گروہ کی ایسی آمریت ملک پر مسلط کر دی جائے جو وہاں کے سیاہ سپید کی مالک ہو اور کوئی اس کے سامنے زبان کھولنے کی جرأت نہ کر سکے۔ پوری قوم بے زبان جانوروں کا ایک گلہ بن کر رہ جائے جسے اقتدار کی اندھی لاٹھی جس طرف چاہے ہانک کر لے جائے۔ اس مزاج کی حامل اور اس طریقِ کار پر عمل پیرا ہونے والی کوئی تحریک کسی ایسے ملک میں آخر کس طرح کامیاب ہو سکتی ہے جہاں قومی اور ملکی مسائل جمہوری روایات کے مطابق طے پاتے ہوں؟ اقتصادی بدحالی، انتشار، رشوت ستانی اور نوکر شاہی کے استبداد سے بددلی کی جو فضا قائم ہوتی ہے وہ کمیونزم کو راس آتی ہے اور جہاں یہ فضا موجود نہ ہو وہاں اس نظام کو پھلنے پھولنے کے مواقع میسر نہیں آسکتے۔ چنانچہ اشتراکی عناصر اگر جمہوری طریق سے کہیں کامیاب بھی ہو جائیں تو وہ فوراً جمہوریت کی فضا کو برباد کر کے اُسے آمریت کے لیے تیار کرنا شروع کر دیتے

ہیں۔ آپ پاکستان کو ہی لیجیے۔ یہاں کے دو صوبوں میں ایک ایسی پارٹی کو واضح اکثریت حاصل ہوئی ہے جو اپنے آپ کو اشتراکیت کی حامی کہتی ہے۔ جمہوریت کا تقاضا یہ ہے کہ ملک میں امن و امان کی فضا قائم ہو اور اس پارٹی کے ارکان مسندِ اقتدار سنبھالنے کے بعد جمہوری روایات اور طریقوں کے مطابق اپنے ان منصوبوں پر عمل کریں جو ان کے پیشِ نظر ہیں اور جن کا وعدہ کر کے انہوں نے عوام سے ووٹ حاصل کیے ہیں۔ اب اس پارٹی کے ہر چھوٹے بڑے کارکُن کا اندازِ فکر و عمل سراسر تعمیری ہونا چاہیے اور اسے اس امر کی کوشش کرنی چاہیے کہ ملک تعمیری راستے پر گامزن ہو۔ مگر یہاں عملاً جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ ایک طرف تو اس پارٹی کا ہر چھوٹا بڑا لیڈر اختلاف کرنے والوں پر برس رہا ہے اور انہیں الم ناک عذاب کی وعید سنا رہا ہے۔ دوسری طرف اس کے کارکن ملک کے اندر افراتفری کی فضا قائم کرنے میں مصروف ہیں اور ہڑتالیں کروا رہے ہیں۔ ان سب حرکتوں کا مقصد ایک ہی ہے کہ ملک کی سیاسی گاڑی جو خوش قسمتی سے جمہوریت کی پٹڑی پر کسی طرح چڑھ گئی ہے اُسے پھر پٹڑی سے اُتار دیا جائے اور ملک میں آمریت، تشدد اور لاقانونیت کی فضا قائم ہو۔ بعض سادہ لوح لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کی بعض جمہوری حکومتیں کمیونزم کو جمہوری راستے سے برسرِ اقتدار آنے میں چونکہ حائل ہوتی ہیں اس لیے اسے مجبوراً غیر جمہوری طریقے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ یہ انتہائی سادگی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کمیونزم جمہوری طریق اور جمہوری روایات کے ساتھ کسی ملک میں اپنا تسلط قائم ہی نہیں کرنا چاہتا اور اگر کبھی اتفاقی طور پر قائم بھی ہو جائے تو وہ اُسے فوراً آمریت میں تبدیل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیتا ہے۔ اس بنا پر جماعت اسلامی کے کام کو اشتراکیت کے کام پر قیاس کر کے کوئی نتیجہ اخذ کرنا کسی طرح بھی صحیح نہیں۔ جماعت اسلامی تو جمہوریت ہی کو اپنے لیے مفید سمجھتی ہے۔ اسی راستے سے وہ عوام کی رائے کو اُن تبدیلیوں کے لیے بتدریج تیار کرنا چاہتی ہے جو اسلامی نظام قائم کرنے کے لیے درکار ہیں، اور اس کے پیشِ نظر یہ ہے کہ رائے عام کی تربیت کر کے انتخابات کے راستے سے بالآخر اسلامی نظام قائم کیا جائے۔

بعض بہی خواہوں کی طرف سے جماعت کو زیادہ سرگرم اور عوامی بنانے کے لیے یہ تجویز بھی پیش کی جا رہی ہے کہ اس کی امارت کا بار کسی دوسرے زیادہ سرگرم قائد کے کندھوں پر ڈال دیا جائے اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو جماعت کی سرپرستی کا کام سپرد کر دیا جائے۔ یہ تجویز بھی ہمارے خیال کے مطابق جماعت اسلامی کے مقصد، مزاج اور طریقِ کار سے عدم واقفیت

کی مظہر ہے۔ جماعت اسلامی جیسی جماعت کے لیے قائد مصنوعی طور پر نہیں بنتا بلکہ وہ بالکل فطری طور پر اُبھرتا ہے۔ جماعت کی قیادت فطری طریقے سے بنی ہے۔ جذباتی اور ہنگامی فیصلوں کی بنا پر وہ نہیں بدل سکتی۔ مولانا کا معاملہ یہ ہے کہ انہوں نے اس تحریک کو اپنے دل و دماغ کی بہترین صلاحیتوں سے پروان چڑھایا ہے اور اسے اپنے خونِ جگر سے سینچا ہے۔ پھر اول روز سے آج تک انہوں نے اس کی عملی رہنمائی بھی کی ہے۔ وہ اسے مختلف مراحل اور مختلف اَدوار سے لیکر آگے بڑھے ہیں۔ وہ اس راہ کی دُشواریوں سے جتنے واقف ہیں کوئی دوسرا واقف نہیں۔ خدا انہیں تادیر سلامت رکھے لیکن ان کی موجودگی میں کسی دوسرے شخص کی عملی سربراہی سے بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہوں گی۔ تحریکِ اسلامی کی قیادت کی نوعیت کسی سیاسی جماعت کی صدر نشینی کی سی نہیں۔ جماعت اسلامی کے ارکان ہمدرد اور متاثرین مولانا پر نہ صرف پُورا اعتماد رکھتے ہیں بلکہ انہیں ان سے والہانہ محبّت بھی ہے۔ ایک ایسی محبت جس میں جذبات و احساسات کا بڑا دخل ہے اور یہ جذبات و احساسات ایک دن میں پیدا نہیں ہو گئے۔ اللہ کے ایک بندے نے برسوں کی محنتِ شاقہ، علمی فضیلت، اخلاقی برتری، تدبر، غیر معمولی ایثار، بلند حوصلگی اور دینِ حق کے لیے قید و بند کی صعوبتیں سہ کر یہ مقام حاصل کیا ہے۔ مولانا اس تحریک کے محض منتخب امیر نہیں بلکہ اس کے فطری قائد اور اپنے رفقاء کی محبت و عقیدت کا مرکز و محور بھی ہیں۔ ان کی موجودگی میں اگر کسی دوسرے شخص کو امیر بنا لیا جائے تو عجیب وغریب قسم کے مسائل پیدا ہوں گے۔ بظاہر وہ تحریک کو آگے لیکر بڑھنے کی کوشش کرے گا مگر عملاً سربراہی مولانا کے ہاتھ میں ہی رہیگی اور وہ خواہ اس سے کسی قدر دامن چھڑائیں اور امارت کی ذمہ داریوں سے خواہ کتنے گریزاں ہوں مگر اس جماعت کی قیادت کا بوجھ انہی کے کندھوں پر رہیگا اور جماعت کی سربراہی کا مسئلہ وہی صورت اختیار کریگا جو گاندھی جی کی قیادت نے کانگریس کے لیے پیدا کر رکھی تھی۔ اس ملک کی سیاسی تاریخ سے معمولی واقفیت رکھنے والا شخص بھی جانتا ہے کہ گاندھی جی کانگرس کے عملی طور پر سربراہ تھے اور یہ جماعت ہر مرحلے پر اُن سے رہنمائی حاصل کرتی تھی۔ انکی رائے کے مطابق تمام امور کے فیصلے کیے جاتے۔ مگر اُن پر کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوتی تھی اور جب بھی انہیں کسی فیصلے سے انحراف کی ضرورت پیش آتی تو وہ بڑی بے تکلفی کے ساتھ یہ کہہ دیتے کہ میں تو جماعت کا چار آنے کا ممبر بھی نہیں ہوں۔ ایک غیر مسلم قیادت تو اس قسم کی ڈپلومیسی سے کام لے سکتی ہے، مگر اُن قائدین کو اس عیاری کے لیے کس طرح آمادہ کیا جا سکتا ہے جو آخرت کی جوابدہی پر ایمان رکھتے ہوں۔ (باقی صٓ ۶۳ پر)

تفہیم القرآن

النازعات

نام | پہلے ہی لفظ وَالنّٰزِعٰتِ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول | حضرت عبداللہ بن عباس کا بیان ہے کہ یہ سورۂ نبأ (عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ) کے بعد نازل ہوئی ہے اس کا مضمون بھی یہی بتا رہا ہے کہ یہ ابتدائی زمانے کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔

موضوع اور مضمون | اس کا موضوع قیامت اور زندگی بعد موت کا اثبات ہے اور ساتھ ساتھ اس بات پر تنبیہ بھی کہ خدا کے رسول کو جھٹلانے کا انجام کیا ہوتا ہے۔

آغازِ کلام میں موت کے وقت جان نکالنے والے، اور اللہ کے احکام کو بلا تاخیر بجا لانے والے اور حکمِ الٰہی کے مطابق ساری کائنات کا انتظام کرنے والے فرشتوں کی قسم کھا کر یہ یقین دلایا گیا ہے کہ قیامت ضرور واقع ہو گی اور موت کے بعد دوسری زندگی ضرور پیش آ کر رہے گی۔ کیونکہ جن فرشتوں کے ہاتھوں آج جان نکالی جاتی ہے، انہی کے ہاتھوں دوبارہ جان ڈالی بھی جا سکتی ہے؛ اور جو فرشتے آج اللہ کے حکم کی تعمیل بلا تاخیر بجا لاتے اور کائنات کا انتظام چلاتے ہیں، وہی فرشتے کل اسی خدا کے حکم سے کائنات کا یہ نظام درہم برہم بھی کر سکتے ہیں اور ایک دوسرا نظام قائم بھی کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ یہ کام، جسے تم بالکل ناممکن سمجھتے ہو، اللہ تعالیٰ کے لیے سرے سے کوئی دشوار کام ہی نہیں ہے جس کے لیے کسی بڑی تیاری کی ضرورت ہو۔ بس ایک جھٹکا دنیا کے اس نظام کو درہم برہم کر دے گا، اور ایک دوسرا جھٹکا اس کے لیے بالکل کافی ہو گا کہ دوسری دنیا میں یکایک تم اپنے آپ کو زندہ موجود پاؤ گے۔ اس وقت وہی لوگ جو اس کا انکار کر رہے تھے،

خوف سے کانپ رہے ہونگے اور سہمی ہوئی نگاہوں سے وہ سب کچھ ہوتے دیکھ رہے ہونگے جس کو وہ اپنے نزدیک ناممکن سمجھتے تھے۔

پھر حضرت موسیٰ اور فرعون کا قصہ مختصراً بیان کر کے لوگوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ رسول کو جھٹلانے اور اس کی ہدایت و رہنمائی کو رد کرنے اور چالبازیوں سے اس کو شکست دینے کی کوشش کا کیا انجام فرعون دیکھ چکا ہے۔ اُس سے عبرت حاصل کر کے اِس روش سے باز نہ آؤ گے تو وہی انجام تمہیں بھی دیکھنا پڑے گا۔

اس کے بعد آیت ۲۷ سے ۳۳ تک آخرت اور حیات بعد الموت کے دلائل بیان کیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں پہلے منکرین سے پوچھا گیا ہے کہ تمہیں مرنے کے بعد دوبارہ پیدا کرنا زیادہ سخت کام ہے یا اِس عظیم کائنات کو پیدا کرنا جو عالمِ بالا میں اپنے بے حد و حساب ستاروں اور سیاروں کے ساتھ پھیلی ہوئی ہے؟ جس خدا کے لیے یہ کام مشکل نہ تھا اس کے لیے تمہاری بارِ دگر تخلیق آخر کیوں مشکل ہوگی؟ صرف ایک فقرے میں امکانِ آخرت کی یہ مسکت دلیل پیش کرنے کے بعد زمین اور اُس سروسامان کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو زمین میں انسان اور حیوان کی زیست کے لیے فراہم کیا گیا ہے اور جس کی ہر چیز اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ وہ بڑی حکمت کے ساتھ کسی نہ کسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے بنائی گئی ہے۔ یہ اشارہ کر کے اس سوال کو انسان کی عقل پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ خود اپنی جگہ سوچ کر رائے قائم کرے کہ آیا اِس حکیمانہ نظام میں انسان جیسی مخلوق کو اختیارات اور ذمّہ داریاں سونپ کر اُس کا محاسبہ کرنا زیادہ مقتضائے حکمت نظر آتا ہے، یا یہ کہ وہ زمین میں ہر طرح کے کام کر کے مر جائے اور خاک میں مل کر ہمیشہ کے لیے فنا ہو جائے اور کبھی اس سے حساب نہ لیا جائے کہ ان اختیارات کو اس نے کیسے استعمال کیا اور ان ذمّہ داریوں کو کس طرح ادا کیا؟ اس سوال پر بحث کرنے کے بجائے آیات ۳۴-۴۱ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب آخرت برپا ہوگی تو انسان کے دائمی اور ابدی مستقبل کا فیصلہ اس بنیاد پر ہوگا کہ کس نے دنیا میں حدِّ بندگی سے تجاوز کر کے اپنے خدا سے سرکشی کی اور دنیا ہی کے فائدوں اور لذّتوں کو مقصود بنا لیا، اور کس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا اور نفس کی ناجائز خواہشات کو پورا کرنے سے احتراز کیا۔ یہ بات خودبخود اُوپر کے سوال کا صحیح جواب ہر اُس شخص کو بتا دیتی ہے جو ضد اور ہٹ دھرمی سے پاک ہو کر ایمانداری کے ساتھ

اُس پر غور کرے۔ کیونکہ انسان کو دنیا میں اختیارات اور ذمہ داریاں سونپنے کا بالکل عقلی منطقی اور اخلاقی تقاضا یہی ہے کہ اسی بنیاد پر آخر کار اُس کا محاسبہ کیا جائے اور اسے جزا یا سزا دی جائے۔

آخر میں کفارِ مکہ کے اِس سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ وہ قیامت آئیگی کب؟ یہ سوال وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے بار بار کرتے تھے۔ جواب میں فرمایا گیا ہے کہ اس کے وقت کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ رسول کا کام صرف خبردار کر دینا ہے کہ وہ وقت آئے گا ضرور۔ اب جس کا جی چاہے اس کے آنے کا خوف کر کے اپنا رویہ درست کرے، اور جس کا جی چاہے بے خوف ہو کر شترِ بے مہار کی طرح چلتا رہے۔ جب وہ وقت آجائے گا تو وہی لوگ جو اِس دنیا کی زندگی پر مرے مٹتے تھے اور اِسی کو سب کچھ سمجھتے تھے، یہ محسوس کریں گے کہ دنیا میں وہ صرف گھڑی بھر ٹھیرے تھے۔ اس وقت انہیں معلوم ہو گا کہ اس چند روزہ زندگی کی خاطر انہوں نے کس طرح ہمیشہ کے لیے اپنا مستقبل برباد کر لیا۔

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

قسم ہے اُن (فرشتوں) کی جو ڈوب کر کھینچتے ہیں، اور آہستگی سے نکال لے جاتے ہیں، اور (اُن فرشتوں کی جو کائنات میں) تیزی سے تیرتے پھرتے ہیں، پھر (حکم بجالانے میں) سبقت کرتے ہیں، پھر (احکام الٰہی کے مطابق) معاملات کا انتظام چلاتے ہیں[1]۔ جس روز ہلا مارے گا زلزلے کا جھٹکا اور اس کے پیچھے ایک اور جھٹکا پڑے گا،[2]

[1] یہاں پانچ اوصاف رکھنے والی ہستیوں کی قسم جس بات پر کھائی گئی ہے اس کی وضاحت نہیں کی گئی۔ لیکن بعد کا مضمون اس امر پر خود دلالت کرتا ہے کہ یہ قسم اِس بات پر کھائی گئی ہے کہ قیامت ضرور آئے گی اور تمام مرے ہوئے انسان ضرور از سرِ نو زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے۔ اِس کی وضاحت بھی نہیں کی گئی کہ یہ پانچ اوصاف کن ہستیوں کے ہیں، لیکن صحابہ اور تابعین کی بڑی تعداد نے اور اکثر مفسّرین نے کہا ہے کہ ان سے مراد فرشتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس، مسروق، سعید بن جُبَیر، ابو صالح، ابو الضُّحٰی اور سُدّی کہتے ہیں کہ ڈوب کر کھینچنے والوں اور آہستگی سے نکال لے جانے والوں سے مُراد وہ فرشتے ہیں جو موت کے وقت انسان کی جان کو اس کے جسم کی گہرائیوں تک اُتر کر اور اس کی رگ رگ سے کھینچ کر نکالتے ہیں۔ تیزی سے تیرتے پھرنے والوں سے

مراد بھی حضرت علی، حضرت ابن مسعود، مجاہد، سعید بن جُبَیر اور ابو صالح نے فرشتے ہی لیے ہیں جو احکامِ الٰہی کی تعمیل میں اس طرح تیزی سے رواں دواں رہتے ہیں جیسے کہ وہ فضا میں تیر رہے ہوں۔ یہی مفہوم "سبقت کرنے والوں" کا حضرت علی، مجاہد، مسروق، ابو صالح اور حسن بصری نے لیا ہے اور سبقت کرنے سے مراد یہ ہے کہ حکمِ الٰہی کا اشارہ پاتے ہی ان میں سے ہر ایک اس کی تعمیل کے لیے دوڑ پڑتا ہے۔ "معاملات کا انتظام چلانے والوں" سے مراد بھی فرشتے ہیں، جیسا کہ حضرت علی، مجاہد، عطاء، ابو صالح، حسن بصری، قتادہ، ربیع بن انس، اور سُدّی سے منقول ہے۔ بالفاظِ دیگر یہ سلطنتِ کائنات کے وہ کارکن ہیں جن کے ہاتھوں دنیا کا سارا انتظام اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق چل رہا ہے۔ ان آیات کے یہ معنی اگرچہ کسی صحیح حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہوئے ہیں، لیکن چند اکابر صحابہ نے، اور اُن تابعین نے جو صحابہ ہی کے شاگرد تھے، جب ان کا یہ مطلب بیان کیا ہے تو گمان یہی ہوتا ہے کہ یہ علم حضورؐ ہی سے حاصل کیا گیا ہوگا۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وقوعِ قیامت اور حیات بعد الموت پر ان فرشتوں کی قسم کس بنا پر کھائی گئی ہے جبکہ یہ خود بھی اُسی طرح غیر محسوس ہیں جس طرح وہ چیز غیر محسوس ہے جس کے واقع ہونے پر ان کو بطورِ شہادت اور بطورِ استدلال پیش کیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے، واللہ اعلم، کہ اہلِ عرب فرشتوں کی ہستی کے منکر نہ تھے۔ وہ خود اِس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ موت کے وقت انسان کی جان فرشتے ہی نکالتے ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ فرشتوں کی حرکت انتہائی تیز ہے، زمین سے آسمان تک آناً فاناً وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتے ہیں اور ہر کام جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے بلا تاخیر انجام دیتے ہیں۔ وہ یہ بھی مانتے تھے کہ یہ فرشتے حکمِ الٰہی کے تابع ہیں اور کائنات کا انتظام اللہ تعالیٰ ہی کے امر سے چلاتے ہیں، خود مختار اور اپنی مرضی کے مالک نہیں ہیں۔ جہالت کی بنا پر وہ اُن کو اللہ کی بیٹیاں ضرور کہتے تھے اور اُن کو معبود بھی بنائے ہوئے تھے، لیکن اُن کا یہ عقیدہ نہیں تھا کہ اصل اختیارات انہی کے ہاتھ میں ہیں۔ اس لیے یہاں وقوعِ قیامت اور حیات بعد الموت پر اُن کے مذکورۂ بالا اوصاف سے استدلال اس بنا پر کیا گیا ہے کہ جس خدا کے حکم سے فرشتے تمہاری جان نکالتے ہیں اسی کے حکم سے وہ دوبارہ جان ڈال بھی سکتے ہیں۔ اور جس خدا کے حکم سے وہ کائنات کا انتظام چلا رہے ہیں اسی کے حکم سے، جب بھی اس کا حکم ہو، اِس کائنات کو وہ درہم برہم بھی کر سکتے ہیں، اور ایک دوسری دنیا بنا بھی سکتے ہیں۔ اس کے حکم کی تعمیل میں ان کی

کچھ دل ہونگے جو اُس روز خوف سے کانپ رہے ہونگے،[۳] نگاہیں ان کی سہمی ہوئی ہونگی۔

یہ لوگ کہتے ہیں "کیا واقعی ہم پلٹا کر پھر واپس لائے جائیں گے؟ کیا جب ہم کھوکھلی بوسیدہ ہڈیاں بن چکے ہونگے؟" کہنے لگے "یہ واپسی تو پھر بڑے گھاٹے کی ہوگی!"[۴] حالانکہ یہ بس اتنا کام ہے کہ ایک زور کی ڈانٹ پڑے گی اور یکایک یہ کھلے میدان میں موجود ہونگے۔[۵]

طرف سے ذرہ برابر بھی سستی یا لمحہ بھر کی تاخیر بھی نہیں ہو سکتی۔

[۲] پہلے جھٹکے سے مراد وہ جھٹکا ہے جو زمین اور اس کی ہر چیز کو تباہ کر دے گا اور دوسرے جھٹکے سے مراد وہ جھٹکا ہے جس کے بعد تمام مردے زندہ ہو کر زمین سے نکل آئیں گے۔ اسی کیفیت کو سورۂ زمر میں یوں بیان کیا گیا ہے "اور صور پھونکا جائے گا تو زمین اور آسمانوں میں جو بھی ہیں وہ سب مرکر گر جائیں گے سوائے اُن کے جنہیں اللہ زندہ رکھنا چاہے۔ پھر ایک دوسرا صور پھونکا جائے گا تو یکایک وہ سب اٹھ کر دیکھنے لگیں گے" (آیت ۶۸)

[۳] "کچھ دل" کے الفاظ اس لیے استعمال کیے گئے ہیں کہ قرآن مجید کی رُو سے صرف کفار و فجار اور منافقین ہی پر قیامت کے روز ہول طاری ہوگا۔ مومنین صالحین اس ہول سے محفوظ ہونگے۔ سورۂ انبیاء میں ان کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ "وہ انتہائی گھبراہٹ کا وقت ان کو ذرا پریشان نہ کرے گا اور ملائکہ بڑھ کر ان کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے کہ یہ تمہارا وہی دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا" (آیت ۱۰۳)۔

[۴] یعنی جب اُن کو جواب دیا گیا کہ ہاں ایسا ہی ہوگا تو وہ مذاق کے طور پر آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ یارو، اگر واقعی ہمیں پلٹ کر دوبارہ زندگی کی حالت میں واپس آنا پڑا تب تو ہم مارے گئے! اس کے بعد تو پھر ہماری خیر نہیں ہے۔

[۵] یعنی یہ لوگ اسے ایک امرِ محال سمجھ کر اس کی ہنسی اڑا رہے ہیں، حالانکہ اللہ کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے جس کو انجام دینے کے لیے کچھ بڑی لمبی چوڑی تیاریوں کی ضرورت ہو۔ اس کے لیے صرف ایک ڈانٹ یا جھڑکی کافی ہے جس کے ساتھ ہی تمہاری خاک یا راکھ، خواہ کہیں پڑی ہو، ہر طرف سے سمٹ کر ایک جگہ جمع ہو جائیگی اور تم یکایک اپنے آپ کو زمین کی پیٹھ پر زندہ موجود پاؤ گے۔ اس واپسی کو گھاٹے کی واپسی سمجھ کر چاہے تم اس سے

کیا تمہیں موسیٰ کے قصے کی خبر پہنچی ہے؟ جب اس کے رب نے اُسے طُویٰ کی مقدّس وادی میں پکارا تھا کہ "فرعون کے پاس جا، وہ سرکش ہو گیا ہے، اور اس سے کہہ کیا تو اس کے لیے تیار ہے کہ پاکیزگی اختیار کرے اور میں تیرے رب کی طرف تیری رہنمائی کروں تو اُس کا خوف تیرے اندر پیدا ہو؟" پھر موسیٰ نے فرعون کے

کتنا ہی فرار کرنے کی کوشش کرو، یہ تو ہو کر رہنی ہے، تمہارے انکار یا فرار یا تمسخر سے یہ رُک نہیں سکتی۔

ے چونکہ کفارِ مکہ کا قیامت اور آخرت کو نہ ماننا اور اس کا مذاق اڑانا دراصل کسی فلسفے کو رد کرنا نہیں تھا بلکہ اللہ کے رسُول کو جھٹلانا تھا، اور جو چالیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف چل رہے تھے وہ کسی عام آدمی کے خلاف نہیں بلکہ اللہ کے رسول کی دعوت کو زک دینے کے لیے تھیں، اس لیے وقوعِ آخرت کے مزید دلائل دینے سے پہلے اُن کو حضرت موسیٰ اور فرعون کا قصہ سنایا جا رہا ہے تاکہ وہ خبردار ہو جائیں کہ رسالت سے ٹکرانے اور رسول کے بھیجنے والے خدا کے مقابلے میں سر اٹھانے کا انجام کیا ہوتا ہے۔

ے وادیٔ مقدسِ طُویٰ کے معنی بالعموم مفسرین نے یہ بیان کیے ہیں کہ "وہ مقدس وادی جس کا نام طُویٰ تھا" لیکن اس کے علاوہ اس کے دو معنی اور بھی بیان کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ "وہ وادی جو دو مرتبہ مقدّس کی گئی"، کیونکہ ایک دفعہ اُسے اُس وقت مقدس کیا گیا جب پہلی مرتبہ اللہ تعالیٰ نے وہاں حضرت موسیٰ کو مخاطب فرمایا، اور دوسری دفعہ اسے تقدیس کا شرف اُس وقت بخشا گیا جب حضرت موسیٰ مصر سے بنی اسرائیل کو نکال کر اِس وادی میں لائے۔ دوسرے یہ کہ "رات کے وقت وادیٔ مقدس میں پکارا"۔ عربی میں محاورہ ہے جاء بعد طُوًی، یعنی فلاں شخص میرے پاس رات کا کچھ حصہ گزرنے کے بعد آیا۔

ے یہاں چند باتیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہییں:

(۱) حضرت موسیٰ کو منصبِ نبوت پر مقرر کرتے وقت جو باتیں اُن کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہوئی تھیں اُن کو قرآن مجید میں حسبِ موقع کہیں مختصر اور کہیں مفصّل بیان کیا گیا ہے۔ یہاں موقع اختصار کا طالب تھا، اس لیے اُن کا صرف خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ طٰہٰ، آیات ۹ تا ۴۸، سورۂ شعراء، آیات ۱۰ تا ۱۷، سورۂ نمل، آیات ۷ تا ۱۲، اور سورۂ قصص، آیات ۲۹ تا ۳۵ میں ان کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔

(۲) فرعون کی جس سرکشی کا یہاں ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد بندگی کی حد سے تجاوز کر کے خالق اور خلق، دونوں کے

مقابلے میں سرکشی کرنا ہے۔ خالق کے مقابلے میں اس کی سرکشی کا ذکر تو آگے آرہا ہے کہ اس نے اپنی رعیت کو جمع کرکے اعلان کیا کہ "میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں"۔ اور خلق کے مقابلے میں اس کی سرکشی یہ تھی کہ اس نے اپنی مملکت کے باشندوں کو مختلف گروہوں اور طبقوں میں بانٹ رکھا تھا، کمزور طبقوں پر وہ سخت ظلم و ستم ڈھا رہا تھا، اور اپنی پوری قوم کو بیوقوف بنا کر اس نے غلام بنا رکھا تھا، جیسا کہ سورۂ قصص آیت ۴ اور سورۂ زخرف آیت ۵۴ میں بیان کیا گیا ہے۔

(۳) حضرت موسیٰ کو ہدایت فرمائی گئی تھی کہ فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ "تم اور ہارون دونوں بھائی اُس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا، شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے اور خدا سے ڈرے (القصص آیت ۴۴)۔ اِس نرم کلام کا ایک نمونہ تو اِن آیات میں دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مبلغ کو کسی بگڑے ہوئے آدمی کی ہدایت کے لیے کس حکمت کے ساتھ تبلیغ کرنی چاہیے۔ دوسرے نمونے سورۂ طٰہٰ، آیات ۴۹ تا ۵۲، الشعراء ۲۳ تا ۲۸، اور القصص، آیت ۳۷ میں دیئے گئے ہیں۔ یہ منجملہ اُن آیات کے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حکمتِ تبلیغ کی تعلیم دی ہے۔

(۴) حضرت موسیٰ صرف بنی اسرائیل کی رہائی کے لیے ہی فرعون کے پاس نہیں بھیجے گئے تھے، جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے، بلکہ ان کی بعثت کا پہلا مقصد فرعون اور اس کی قوم کو راہ راست دکھانا تھا، اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ اگر وہ راہِ راست قبول نہ کرے تو بنی اسرائیل کو (جو اصل میں ایک مسلمان قوم تھے) اُس کی غلامی سے چھڑا کر مصر سے نکال لائیں۔ یہ بات اِن آیات سے بھی ظاہر ہوتی ہے، کیونکہ ان میں سرے سے بنی اسرائیل کی رہائی کا ذکر ہی نہیں ہے بلکہ حضرت موسیٰ کو فرعون کے سامنے صرف حق کی تبلیغ پیش کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور اُن مقامات سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے جہاں حضرت موسیٰ نے تبلیغِ اسلام بھی کی ہے اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ بھی فرمایا ہے۔ مثلاً ملاحظہ ہو الاعراف، آیات ۱۰۴-۱۰۵۔ طٰہٰ، آیات ۴۷ تا ۵۲۔ الشعراء، آیات ۱۶-۱۷، ۲۳ تا ۲۸۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، یونس، حاشیہ ۷۴)۔

(۵) یہاں پاکیزگی (تَزَكِّی) اختیار کرنے کا مطلب عقیدے اور اخلاق اور اعمال کی پاکیزگی اختیار کرنا، یا دوسرے الفاظ میں اسلام قبول کر لینا ہے۔ ابن زید کہتے ہیں کہ قرآن میں جہاں بھی تزکی کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں اس سے مراد اسلام قبول کرنا ہی ہے۔ چنانچہ وہ مثال میں قرآن مجید کی حسب ذیل تین آیات کو پیش کرتے ہیں:

پاس جا کر، اُس کو بڑی نشانی دکھائی ۹، مگر اُس نے جھٹلا دیا اور نہ مانا، پھر چالبازیاں کرنے کے لیے پلٹا ۱۰ اور لوگوں کو جمع کر کے اس نے پکار کر کہا "میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں" ۱۱۔ آخر کار اللہ نے اسے آخرت اور دنیا کے عذاب

وَذٰلِكَ جَزَاءُ مَنْ تَزَكّٰى "اور یہ جزا ہے اس کی جو پاکیزگی اختیار کرے" یعنی اسلام لے آئے۔ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكّٰى "اور تمہیں کیا خبر شاید کہ وہ پاکیزگی اختیار کرے" یعنی مسلمان ہو جائے۔ وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزَّكّٰى "اور تم پر کیا ذمہ داری ہے اگر وہ پاکیزگی اختیار نہ کرے" یعنی مسلمان نہ ہو (ابن جریر)۔

(۶) یہ ارشاد کہ "میں تیرے رب کی طرف تیری رہنمائی کروں تو (اس کا خوف) تیرے دل میں پیدا ہو" اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تو اپنے رب کو پہچان لے گا اور تجھے معلوم ہو جائے گا کہ تو اُس کا بندہ ہے، مرد آزاد نہیں، تو لازماً تیرے دل میں اُس کا خوف پیدا ہو گا۔ اور خوفِ خدا ہی وہ چیز ہے جس پر دنیا میں آدمی کے رویے کے صحیح ہونے کا انحصار ہے۔ خدا کی معرفت اور اس کے خوف کے بغیر کسی پاکیزگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

۹ بڑی نشانی سے مراد عصا کا اژدہا بن جانا ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں متعدد مقامات پر کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑی نشانی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک بے جان لاٹھی سب دیکھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے علانیہ اژدہا بن جائے، جادوگر اس کے مقابلے میں لاٹھیوں اور رسیوں کے جو مصنوعی اژدھے بنا کر دکھائیں ان سب کو وہ نگل جائے، اور پھر حضرت موسیٰ جب اس کو پکڑ کر اٹھا لیں تو وہ پھر لاٹھی کی لاٹھی بن کر رہ جائے۔ یہ اس بات کی صریح علامت تھی کہ وہ اللہ رب العالمین ہی ہے جس کی طرف سے حضرت موسیٰ بھیجے گئے ہیں۔

۱۰ اس کی تفصیل دوسرے مقامات پر قرآن مجید میں یہ بیان کی گئی ہے کہ اس نے تمام مصر سے ماہر جادوگروں کو بلوایا اور ایک مجمع عام میں ان سے لاٹھیوں اور رسیوں کے اژدہے بنوا کر دکھائے تاکہ لوگوں کو یقین آ جائے کہ موسیٰ علیہ السلام کوئی نبی نہیں بلکہ ایک جادوگر ہیں، اور لاٹھی کا اژدہا بنانے کا جو کرشمہ انہوں نے دکھایا ہے وہ دوسرے جادوگر بھی دکھا سکتے ہیں۔ لیکن اس کی یہ چال اُلٹی پڑی اور جادوگروں نے شکست کھا کر خود تسلیم کر لیا کہ موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ دکھایا ہے وہ جادو نہیں بلکہ معجزہ ہے۔

۱۱ فرعون کا یہ دعویٰ کئی مقامات پر قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک موقع پر اس نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ "اگر تم نے میرے سوا کسی اور کو خدا بنایا تو میں تمہیں قید کر دوں گا" (الشعراء، آیت ۲۹)۔ ایک اور موقع پر

اع میں پکڑ لیا۔ درحقیقت اس میں بڑی عبرت ہے ہر اُس شخص کے لیے جو ڈرے[۱۲] ع

اس نے اپنے دربار میں لوگوں کو خطاب کر کے کہا "اے سردارانِ قوم، میں نہیں جانتا کہ میرے سوا تمہارا کوئی اور خدا ہے" (القصص، آیت ۳۸)۔ ان ساری باتوں سے فرعون کا یہ مطلب نہ تھا، اور نہیں ہو سکتا تھا کہ وہی کائنات کا خالق ہے اور اسی نے یہ دنیا پیدا کی ہے۔ یہ مطلب بھی نہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا منکر اور خود رب العالمین ہونے کا مدعی تھا۔ یہ مطلب بھی نہ تھا کہ وہ صرف اپنے آپ ہی کو مذہبی معنوں میں لوگوں کا معبود قرار دیتا تھا۔ قرآن مجید ہی میں اس بات کی شہادت موجود ہے کہ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے وہ خود دوسرے معبودوں کی پرستش کرتا تھا، چنانچہ اس کے اہلِ دربار ایک موقع پر اس کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ "کیا آپ موسیٰ اور اس کی قوم کو یہ آزادی دیتے چلے جائیں گے کہ وہ ملک میں فساد پھیلائیں اور آپ کو اور آپ کے معبودوں کو چھوڑ دیں؟" (الاعراف، آیت ۱۲۷)۔ اور قرآن میں فرعون کا یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے کہ اگر موسیٰ خدا کا بھیجا ہوا ہوتا تو کیوں نہ اس پر سونے کے کنگن اتارے گئے؟ یا اس کے ساتھ ملائکہ اس کی اردلی میں کیوں نہ آئے؟ (الزخرف، آیت ۵۳)۔ پس درحقیقت وہ مذہبی معنی میں نہیں بلکہ سیاسی معنی میں اپنے آپ کو الٰہ اور ربِ اعلیٰ کہتا تھا، یعنی اس کا مطلب یہ تھا کہ اقتدارِ اعلیٰ کا مالک میں ہوں، میرے سوا کسی کو میری مملکت میں حکم چلانے کا حق نہیں ہے، اور میرے اوپر کوئی بالاتر طاقت نہیں ہے جس کا فرمان یہاں جاری ہو سکتا ہو۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۸۵۔ جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۲۱۔ الشعراء، حواشی ۲۴ و ۲۶۔ القصص، حواشی ۵۲-۵۳۔ جلد چہارم الزخرف، حاشیہ ۴۹)۔

[۱۲] یعنی خدا کے رسول کو جھٹلانے کے اُس انجام سے ڈرے جو فرعون دیکھ چکا ہے۔

فقر و فاقہ اور اُس کا اسلامی حل!

(۱۰)

یُوسف القرضاوی

ترجمہ و تلخیص: عبدالحمید صدیقی

کونسا مذہب قابلِ اتباع ہے؟ تقسیمِ زکوٰۃ کے بارے میں فقہِ اسلامی کے مختلف مذاہب میں سے اِن دو مذہبوں کو پیش کرنے کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں میں سے کونسا مذہب قابلِ اتباع ہے؟ محتاج و فقیر کو عمر بھر کی ضروریاتِ زندگی ایک دفعہ مہیا کر دینے والا مذہب یا سال بھر کی ضروریات ہر سال مہیا کرنے والا مذہب؟ درحقیقت ان میں سے ہر مذہب اپنے درست ہونے کے دلائل رکھتا ہے۔ خصوصاً اُس وقت جب کہ ہم چاہیں کہ زکوٰۃ کے جمع و تقسیم کا معاملہ اسلامی حکومت اپنے ہاتھ میں لے دونوں پر حالات کے لحاظ سے عمل کرنا ممکن ہے، کیونکہ دونوں کا دائرہ عمل الگ ہو سکتا ہے۔

محتاج و مساکین دو قسم کے ہوتے ہیں۔ پہلی قسم اُن ضرورت مندوں پر مشتمل ہے جو کام کر کے اپنی روزی کما سکتے ہیں اور خود اپنی ضروریاتِ زندگی کو پورا کر سکتے ہیں۔ مثلاً کاریگر، دوکاندار، کسان وغیرہ۔ مگر ان کے پاس کام کرنے کے اوزار، تجارت کے لیے سرمایہ، یا زمین اور کاشتکاری اور آبپاشی کے آلات نہیں ہیں۔ ایسے حاجتمندوں کے لیے ضروری ہے کہ انہیں زکوٰۃ میں سے اتنی رقم دے دی جائے جس سے وہ عمر بھر اپنی روزی کما سکیں، اپنی ضروریاتِ زندگی کو پورا کر سکیں، اور دوبارہ زکوٰۃ کے محتاج نہ ہوں۔ دورِ حاضر میں اس تجویز پر یُوں بھی عمل کیا جا سکتا ہے کہ زکوٰۃ کے مال سے کارخانے اور تجارتی ادارے بنا کر اُن محتاجوں اور ضرورت مندوں کی ملکیت میں دے دیئے جائیں جو کام کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔

دوسری قسم اُن لوگوں پر مشتمل ہے جو کام اور کسب سے بالکل عاجز ہیں۔ مثلاً اپاہج، اندھا، پیرِ فرتوت

بیوائیں اور بچے وغیرہ۔ ایسے محتاجوں کو سال بھر کی ضروریاتِ زندگی کے لیے ہر سال زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، بلکہ اگر یہ ڈر ہو کہ یکمشت رقم وصول کرکے وہ اسے غیرضروری کاموں میں صرف کر دیں گے یا خرچ کرنے میں اسراف و تبذیر سے کام لیں گے تو صحیح ترین بات یہ ہے کہ انہیں مہینے بھر کی ضروریات کے مطابق ہر ماہ ایک مقررہ رقم دے دی جائے۔ دورِ حاضر میں اس تجویز پر بالکل اُس طرح عمل کیا جانا چاہیے جس طرح ملازمین کو تنخواہیں دی جاتی ہیں۔

حسنِ اتفاق دیکھیے کہ جب میں تقسیمِ زکوٰۃ کے اس طریقے پر اظہارِ خیال کر چکا تو مجھے بعض کُتبِ حنابلہ میں بھی یہی طریقہ مُندرج ملا۔ چنانچہ غایۃ المنتہیٰ اور اس کی شرح میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول کہ "اگر کسی شخص کے پاس اتنی جائیداد یا زمین ہو جس سے وہ دس ہزار روپیہ یا اس سے زیادہ کما سکتا ہو اور اتنی آمدنی اس کے لیے ناکافی ہو تو اس کو یہ جائز ہے کہ وہ حسبِ کفایت زکوٰۃ لے لے" نقل کرکے کہا گیا ہے کہ بنابریں یہ ضروری ہے کہ کسی پیشہ ور کو اپنے پیشے کے آلات کی قیمت دی جائے خواہ کتنی ہی زیادہ ہو اور تاجر کو حسبِ کفایت سرمایہ دیا جائے اور ان کے علاوہ جو فقیر و مسکین ہوں انہیں اتنی رقم دی جائے جو اُن کے لیے اور اُن کے کنبوں کے لیے سال بھر کو کافی ہو، کیونکہ اگلے سال پھر انہیں حسبِ کفایت زکوٰۃ مل جائے گی۔

معقول معیارِ زندگی اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں زکوٰۃ کا مقصد محتاج اور فقیر کو چند درہم عطا کر دینا نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ معقول و مناسب معیارِ زندگی قائم کیا جائے جو اُس انسان کی انسانیت کے شایانِ شان ہو جسے اللہ تعالیٰ نے انسانیت اور استخلاف فی الارض سے سرفراز فرمایا ہے، اور اُس مسلمان کے مناسبِ حال ہو جو دینِ عدل و احسان سے نسبتِ خاص رکھتا ہے اور جو اُس بہترین اُمت سے منسوب ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ساری انسانیت کی ہدایت کے لیے پیدا فرمایا ہے۔ علامہ ابن حزم نے المحلّٰی میں اور امام نوویؒ نے المجموع میں اور بہت سے دوسرے علماء و فقہاء نے کہا ہے کہ کم ازکم جس چیز سے انسانی زندگی کا معیار قائم ہوتا ہے یہ ہے کہ انسان کو خورد و نوش کی مناسب ضر[illegible]ت، گرمیوں اور سردیوں میں پہننے کے لیے الگ الگ کپڑے اور رہائش کے لیے اس کے مناس[illegible]ل مکان وغیرہ مہیا ہو۔ امام نوویؒ کفایت

کی تعریف یوں کرتے ہیں: "جس کے بغیر انسان فقیر ہو جاتا ہے (مسکین نہیں کیونکہ وہ امام موصوف کے نزدیک فقیر کے مقابلے میں خوشحال ہوتا ہے)۔ پس جب یہ کہا جاتا ہے کہ کسی شخص کے پاس حسبِ کفایت ضروریاتِ زندگی ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے پاس سامانِ خورونوش، پہننے کے لیے کپڑے، رہائش کے لیے مکان اور دیگر مناسبِ حال ضروریات مہیا ہوں جن کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔ اور وہ انہیں برتنے میں نہ تو اسراف سے کام لے اور نہ کنجوسی سے۔"

دورِ حاضر میں یہ بھی انسان کی ناگزیر ضروریات میں ہے کہ اس کے بچے احکامِ دین کی تعلیم حاصل کریں اور اپنے وقت کے مروجہ علومِ مفیدہ سے بھی آگاہی حاصل کریں تاکہ وہ جہالت و لاعلمی کے اندھیروں سے نکل سکیں اور ایک باعزت زندگی گزارنے کے قابل ہو سکیں اور دین و دنیا کے فرائض بہ احسن وجوہ انجام دے سکیں۔ فقہاء نے مسلمان فرد کی اصلی ضروریاتِ زندگی پر بحث کرتے ہوئے ذکر کیا ہے کہ مسلمان کی پہلی ضرورت تو یہ ہے کہ اس کو جہالت کے اندھیروں سے نکال کر علم و آگہی کی روشنی کی طرف لایا جائے۔ کیونکہ جہالت ادبی موت اور معنوی ہلاکت ہے۔

دوسری ناگزیر ضرورت یہ ہے کہ اگر وہ یا اس کے کنبے کا کوئی فرد بیمار ہو تو علاج کی سہولتیں میسّر ہوں نہ کہ اسے اس حالت میں چھوڑ دیا جائے کہ وہ بیماری میں مبتلا رہ کر آخر جان دے دے۔ یہ تو قتلِ نفس ہے۔ اور خود کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اے اللہ کے بندو! اپنے امراض کے لیے دوا دارو کیا کرو کیونکہ جس خدا نے بیماری یا مرض کو پیدا کیا ہے اُسی نے دوا کو بھی پیدا کیا ہے[۱]۔ اور فرمانِ خداوندی ہے وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ[۲] (اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو)۔ اور وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا[۳] "اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔ بیشک اللہ تمہارے ساتھ بہت رحم کرنے والا ہے"۔

صحیح بخاری میں ہے کہ المسلم اخو المسلم لا یظلمہ ولا یسلمہ "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے وہ اُس پہ ظلم نہیں کرتا اور نہ اُسے بے یار و مددگار چھوڑ دیتا ہے"۔ اگر کوئی مسلمان اپنے والدین کو یا کوئی مسلم معاشرہ کسی فرد کو کسی مرض میں مبتلا چھوڑ دے اور اس کا علاج نہ کرے تو اُس نے بلاشبہ اُسے بے یار و مددگار چھوڑا اور

---

[۱] بخاری [۲] سورہ البقرہ، ۱۹۵ [۳] سورۃ النساء ۲۸۔

ذلیل و رسوا کیا۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ کسی شخص کے معیارِ زندگی کی کوئی حتمی اور قطعی حد بندی نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ وہ زمان و مکان، قومی دولت اور قومی آمدنی کی مقدار کے مختلف ہونے کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ بعض چیزیں کسی زمانے اور قوم میں تعیّشات میں شمار ہوتی ہیں، جب کہ وہی چیزیں کسی دوسرے زمانے اور قوم میں احتیاجات سمجھی جاتی ہیں۔

باقاعدہ دائمی اعانت جب ہمیں یہ معلوم ہو گیا کہ زکوٰۃ سے اسلام جو مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ فقیر اور کوئی کام نہ کر سکنے والے مسکین اور ان کے کنبوں کے لیے معقول معیارِ زندگی کی ضمانت دی جائے، اور اسلام اس مقصد کے حصول کے لیے انہیں پورے ایک سال کی ضروریاتِ زندگی کے لیے کافی رقم بھی دیتا ہے، تو ہمیں اس میں اتنا اضافہ کر لینا چاہیے کہ زکوٰۃ ایسے مستحق افراد کے لیے ایک قسم کی دائمی اور باقاعدہ اعانت ہے۔ یہاں تک کہ غنا فقر کو، قدرتِ کار عجز کو اور کسب و کاربیکاری کو دُور کر دے۔ ابو عبید نے الاموال میں ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک روز حضرت عمر رضی اللہ عنہ دوپہر کے وقت کسی درخت کے سائے میں قیلولہ فرما رہے تھے کہ ایک بدو عورت کسی ایسے آدمی کو تلاش کرتی ہوئی آپ کے پاس آئی جس سے بھلائی کی توقع کی جا سکے اور کہنے لگی "میں ایک مسکین عورت ہوں اور میرے بچے بھی ہیں۔ امیر المومنین عمر بن خطاب نے محمد بن مَسْلَمہ کو زکوٰۃ جمع اور تقسیم کرنے کے لیے بھیجا تھا مگر اُس نے ہمیں کچھ نہیں دیا۔ خدا تم پر رحم کرے ذرا میری سفارش تو اُس کے پاس کر دو۔" آپؓ نے اپنے خادم یرفاء کو آواز دی اور کہا کہ محمد بن مَسْلَمہ کو بلا کر لاؤ۔ اس عورت نے کہا "اگر تم میرے ساتھ اس کے پاس چلو تو میرا کام ضرور ہو جائے گا۔" آپؓ نے کہا "انشاء اللہ وہ ابھی کرے گا۔" یرفاء محمد بن مسلمہ کے پاس گیا اور کہنے لگا "خلیفہ تمہیں بلاتے ہیں۔" ابن مسلمہ آپؓ کے پاس آئے اور کہا "اے امیر المومنین! السلام علیکم!" یہ سُن کر وہ عورت کچھ شرمندہ ہو گئی۔ حضرت عمرؓ نے ابنِ مسلمہ سے کہا "بخدا! میں تم میں سے بہترین افراد کو زکوٰۃ کے جمع و تقسیم کے لیے منتخب کرتا رہا ہوں۔ جب خدائے عزّ وجل تم سے اس عورت کے متعلق پوچھے گا تو تم کیا جواب دو گے؟" یہ سُن کر محمد بن مسلمہ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کو ہماری طرف مبعوث فرمایا تو ہم نے اُن کی تصدیق

کی اور اُن کا کہا مانا اور آپ نے احکامِ خداوندی پر پُورا پُورا عمل کیا او فقراء و مساکین جو زکوٰۃ وغیرہ کے مستحق تھے انہیں زکوٰۃ دیتے رہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی رُوح قبض کر لی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں کی خلافت کا موقع دیا۔ آپؓ نے بھی زکوٰۃ کے معاملے میں سُنّتِ نبویؐ پر پُورا پُورا عمل کیا تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں موت دے دی۔ پھر مجھے خلافت کا موقع ملا تو میں تم میں سے بہترین افراد کو زکوٰۃ کے جمع و تقسیم کے لیے مقرر کرتا رہا۔ اب اگر میں نے تمہیں بھیجا تو اِس عورت کو اِس سال اور پہلے سال دونوں کی زکوٰۃ دینا۔ مجھے معلوم نہیں شاید میں تمہیں نہ بھیجوں"۔ پھر آپؓ نے اُس عورت کے لیے ایک اُونٹ منگوایا اور اُسے کچھ آٹا اور گھی دے کر فرمایا "یہ لے لو اور ہمیں خیبر کے مقام پر ملنا کیونکہ ہم وہاں جارہے ہیں"۔ وہ عورت خیبر کے مقام پر آپ کے پاس حاضر ہوئی تو آپ نے اس کے لیے دو اور اونٹ منگوائے اور فرمایا "یہ لے لو۔ یہ اتنی دیر تمہارے گزارے کے لیے کافی ہے کہ محمد بن مسلمہ دوبارہ تمہارے ہاں آئے۔ میں نے اُسے حکم دے دیا ہے کہ وہ تمہیں سالِ رواں یا سالِ گذشتہ دونوں کی زکوٰۃ کا حصّہ دے"۔

یہ واقعہ اور امیر المومنین عمر اور محمد بن مسلمہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور مسکین بدّو عورت کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ کس بات پر دلالت کرتی ہے؟

- یہ واقعہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مسلمان حکمران کو اسلامی حکومت کے زیرِ سایہ رہنے والے ہر فرد کے بارے میں اپنی مسئولیت اور ذمّہ داری کا کس قدر احساس ہوتا ہے۔
- اس واقعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود مسلمان معاشرے کے افراد کو اپنے شایانِ شان زندگی گزارنے کے لیے اُس حق کا کس قدر احساس ہوتا ہے جو انہیں مسلمان حکومت دیتی ہے۔
- اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ زکوٰۃ معاشرے میں معاشی تحفظ کی عمارت کا بنیادی ستون ہے۔
- اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زکوٰۃ ایک مستقل اور باقاعدہ اعانت ہے جو اگر کسی مستحق تک نہ پہنچے تو اس کا یہ حق ہے کہ وہ حاکمِ وقت کے پاس شکایت کر کے اپنا حق طلب کرے۔
- اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کے بارے میں حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کی حکمتِ عملی یہ تھی کہ مستحق کو اتنا دے دو جو اُسے کافی ہو اور مزید سے بے نیاز کر دے۔ چنانچہ پہلے آپ نے اُس بدو عورت کو آٹے اور گھی سے

لدا ہُوا ایک اُونٹ دیا، پھر دو اُونٹ اور دیئے اور کہا کہ یہ اُس وقت تک تمہارے گزارے کے لیے ہے جب تک کہ محمد بن مسلمہ تمہارے ہاں آکر سالِ رواں اور سالِ گزشتہ دونوں کی زکوٰۃ میں سے تمہارا حق تمہیں نہ دے دے۔

● ان سب کے بعد یہ واقعہ اس بات کی بھی واضح شہادت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے اس طرزِ عمل میں نئے نہیں تھے بلکہ وہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے طرزِ عمل کے تبع تھے۔

مالِ زکوٰۃ کی تقسیم میں اسلام کی سیاست تقسیمِ زکوٰۃ کے بارے میں اسلام نے جو حکیمانہ اور عادلانہ پالیسی اختیار کی ہے وہ دورِ حاضر جس میں پیش کیے جانے والے نظام ہائے زندگی اور قانون سازیوں کو بعض لوگ جدید بلکہ بالکل جدید سمجھتے ہیں ہے کے جملہ ترقی یافتہ سیاسی اور مالی نظاموں کے مقابلے میں پیش کی جا سکتی ہے۔ یہ حقیقت بھی معلومِ عام ہے کہ دَورِ جاہلیت اور قرونِ مظلمہ میں یورپ کے اندر کسانوں، صنعت کاروں، کاریگروں اور تجارت پیشہ لوگوں سے کس طرح ٹیکس اور محصول وغیرہ وصول کیے جاتے تھے جو اپنے ہاتھ کی محنت، پیشانی کے پسینے، رات کی بے خوابی اور دن بھر کی مشقت سے اپنی روزی کماتے تھے۔ اور یہ دولت جس میں خونِ مزدور شامل ہوتا تھا کس طرح شہنشاہ، بادشاہ، امیر یا سلطان کو اُس کے عالیشان دارالحکومت میں پہنچتی تھی۔ اور وہ اسے اپنے تاج و تخت کے استحکام، اپنی شان و شوکت کی نمائش، اور اپنے حاشیہ برداروں، ہم نشینوں اور پیرو کاروں پر خرچ کرتا تھا۔ اور اگر اپنی ضرورت سے کچھ زائد دولت ہوتی تھی وہ شہر کی توسیع و آرائش اور اس کے باشندوں کی رضا جوئی کے لیے خرچ کی جاتی تھی۔ اور اگر پھر بھی کچھ دولت بچ جاتی تھی تو وہ اُن شہروں کے لیے ہوتی تھی جو اس شہنشاہ یا سلطان کی بارگاہِ عالی سے قریب تر ہوتے تھے، اور وہ اُن محنت کش اور مشقت اٹھانے والے اور بارگاہِ عالی سے دُور علاقوں کو بالکل درخورِ اعتناء نہیں سمجھتے تھے جن سے ٹیکسوں اور محصول وغیرہ کی شکل میں یہ دولت حاصل کی جاتی تھی۔

اسلام نے آکر جب مسلمانوں کو زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا تو مسلمان حکمران کو بھی یہ حکم دیا کہ وہ اہلِ ثروت اور اُن کے مالوں کو مطہر و مزکّی کرنے کے لیے اُن سے زکوٰۃ وصول کریں اور معاشرے کے محتاج و فقیر طبقوں کو

فقر کی ذلت اور محتاجی کی پستی سے نجات دلانے کا انتظام کریں، حتیٰ کہ سارے مسلم معاشرے میں امدادِ باہمی اور عدل و انصاف کا دَور دورہ ہو جائے۔ خدائے بزرگ و برتر کی طرف سے جب زکوٰۃ کا حکم دیا گیا تو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے عاملینِ زکوٰۃ کو مختلف علاقوں میں زکوٰۃ جمع کرنے کے لیے بھیجتے وقت یہ حکم دیا کہ اُن علاقوں کے دولتمندوں سے زکوٰۃ لے کر انہیں علاقوں کے فقراء و مساکین میں تقسیم کر دو۔ گذشتہ صفحات میں مُعاذ بن جبل کی حدیث گزر چکی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یمن کی طرف بھیجا تھا اور حکم دیا تھا کہ وہاں کے اغنیاء سے زکوٰۃ لے کر وہیں کے فقراء کو دے دی جائے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان پر اسی طرح عمل کیا اور اہلِ یمن کی زکوٰۃ وہیں کے مستحق افراد میں تقسیم کر دی بلکہ ہر علاقے کی زکوٰۃ وہیں کے محتاجوں اور مساکین میں بانٹ دی اور اُن کے نام ایک تحریری پیغام بھیجا کہ جو شخص اپنے خاندانی علاقے سے نقلِ مکانی کر گیا ہو، اس کی زکوٰۃ اور عُشر اُس کے خاندانی علاقے ہی میں صرف کی جائے گی۔

ابو جُحیفہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مُصدِق (صدقہ زکوٰۃ وغیرہ جمع کرنے والا) ہمارے ہاں آیا تو اُس نے ہمارے اغنیاء سے زکوٰۃ لے کر ہمارے فقراء میں بانٹ دی۔ مَیں اس وقت ایک یتیم لڑکا تھا، اُس نے زکوٰۃ میں سے مجھے ایک اونٹنی دی تھی۔ صحیح بخاری کی روایت ہے کہ ایک بدو نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سے سوالات پوچھے جن میں سے ایک یہ تھا "قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا! کیا آپ کو خدا تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ آپ ہمارے اغنیاء سے زکوٰۃ لے کر ہمارے فقراء میں تقسیم کر دیں؟" آپؐ نے جواب دیا "ہاں"۔ ابو عُبیدہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی وصیت میں فرمایا "مَیں اپنے بعد ہونے والے خلیفہ کو یہ وصیت کرتا ہوں، یہ وصیت کرتا ہوں کہ بدوؤں کے ساتھ بھلائی کرنا کیونکہ وہی اصل عرب ہیں اور وہی اسلام کا ہیولیٰ ہیں اور ان کی ضرورت سے زاید مال لے کر فقراء کو دے دینا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زندگی میں بھی اسی پر عمل رہا کہ جہاں سے مال جمع کیا جاتا وہیں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ اور محصّلین (زکوٰۃ صدقات اور خراج وغیرہ جمع کرنے والے) اس حالت میں مدینہ واپس آتے تھے کہ اُن کے پاس سوائے پالان کے نیچے کے کپڑوں (جن کو وہ اپنے جسموں کے گرد لپیٹ لیتے تھے) اور اپنی

لاٹھیوں کے جن پر وہ ٹیک لگاتے تھے اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ حضرت سعیدؒ بن مُسَیّب سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو بنو کلاب اور بنو سعد بن ذبیان کا محصّل بنا کر بھیجا۔ انہوں نے جو زکوٰۃ و صدقات وغیرہ جمع کیے وہ سب کے سب اُنہی کے غرباء و فقراء میں تقسیم کر دیئے حتیٰ کہ جب واپس آئے تو اُن کے پاس وہی بوریا تھا جو وہ اپنی گردن پر ڈال کر گئے تھے۔ یعلیٰ بن اُمیہ کے ساتھیوں اور اُن لوگوں میں سے کچھ لوگ کہتے ہیں جنہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عاملِ زکوٰۃ مقرر فرمایا تھا کہ ہم زکوٰۃ و صدقات وغیرہ وصول کرنے نکلتے تھے اور جب لوٹتے تھے تو ہمارے پاس صرف اپنے چابک ہوتے تھے۔ زکوٰۃ کے جمع و تقسیم کا یہ طریقہ جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور اُن خلفائے راشدین نے جاری کیا تھا اُسی پر بعد میں آنے والے عدل گستر مسلمان حکمران اور صحابہ اور تابعین میں سے وہ فقہاء چلے جو فتویٰ میں امام مانے جاتے تھے۔ چنانچہ عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہیں اپنے پدر زادے زیاد یا بنو اُمیہ کے عہد کے اُمراء میں سے کسی امیر کی طرف سے کسی علاقے پر عاملِ زکوٰۃ مقرر کیا گیا جب وہ واپس آئے تو امیر نے اُن سے کہا "مال کہاں ہے؟" انہوں نے کہا "کیا مال لانے کے لیے تم نے مجھے بھیجا تھا؟ ہم نے مال وصول کیا جہاں سے ہم رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانے میں وصول کرتے تھے اور دے دیا جہاں ہم اس وقت دیا کرتے تھے۔

امام ابو عُبیدؒ فرماتے ہیں کہ یہ ساری احادیث ثابت کرتی ہیں کہ ہر علاقے کے لوگوں کا اپنے علاقے کے صدقات و زکوٰۃ پر حق مقدم ہے تاوقتیکہ وہ اُن کے ضرورت مند نہ رہیں۔ ہمارے خیال میں اُن کا حق اس لیے مقدم ہے کہ سُنّتِ نبویؐ اس کی تائید کرتی ہے اور وہ لوگ اپنی قوم کے دولتمندوں کے گھروں کے قریب اور اُن کی ہمسائگی میں رہنے کی وجہ سے اُن سے ایک خاص تعلق رکھتے ہیں۔ اگر کوئی مُصدِق (صدقہ و زکوٰۃ وصول کرنے والا) غلطی سے ایک علاقے کی زکوٰۃ دوسرے علاقے میں لے جاتے دراں حالیکہ پہلے علاقے کے رہنے والوں کو اس کی زیادہ ضرورت ہے، تو حاکمِ وقت اُسے واپس کروا سکتا ہے جیسا کہ عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے کیا اور سعید بن جُبیر نے فتویٰ دیا۔

امام ابراہیم نخعیؒ اور حسن بصریؒ دونوں نے یہ جائز قرار دیا ہے کہ آدمی صدقہ و خیرات دینے میں

اپنے قرابتداروں کو ترجیح دے سکتا ہے۔ امام ابوعُبید فرماتے ہیں کہ یہ تو انسان صرف اپنے خاص مال میں سے صدقہ وغیرہ دینے میں کر سکتا ہے۔ مگر جو صدقات یعنی زکوٰۃ وغیرہ جمہور اُمّت کا حق ہیں اور جن کا وصول کرنا اور تقسیم کرنا حاکمانِ وقت کے ذمّہ ہے اُن میں کوئی شخص کسی قسم کے تصرّف کا اختیار نہیں رکھتا۔

ان دونوں بزرگوں کی طرح ابوالعالیہ کی ایک حدیث ہے کہ وہ اپنی زکوٰۃ مدینہ منورہ لے جایا کرتے تھے۔ ابوعبید فرماتے ہیں کہ ہمارا خیال ہے کہ وہ تو اپنے قریبیوں اور رشتہ داروں کو زکوٰۃ دیتے تھے۔

جس طرح اس بات پر اجماعِ اُمّت ہے کہ زکوٰۃ جس علاقے سے وصول کی جائے گی اُسی میں تقسیم کردی جائے گی اسی طرح یہ بات بھی متفق علیہ ہے کہ اگر کسی خاص علاقے کے رہنے والوں کو زکوٰۃ کی ضرورت نہ رہے خواہ اس عدمِ ضرورت کی وجہ وہاں مستحق زکوٰۃ طبقوں کا ختم ہوجانا ہو یا اُن کی تعداد کی کمی اور مالِ زکوٰۃ کی فراوانی ہو تو دوسرے علاقوں کے مستحق افراد کی طرف یا حاکمِ وقت کی طرف منتقل کی جاسکتی ہے کہ وہ زکوٰۃ کے دوسرے مصارف میں اسے صرف کرے یا اس علاقے سے قریب ترین علاقوں میں بھیج دے۔ اس سلسلے میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول بھی بہت خوب ہے کہ ایک علاقے کی زکوٰۃ دوسرے علاقے میں لے جانی جائز نہیں ——— مگر اس صورت میں کہ کسی علاقے کے باشندوں کو اُس کی ضرورت ہو اور حاکمِ وقت بربنائے اجتہاد کسی دوسرے علاقے کی زکوٰۃ اُن کی طرف منتقل کردے۔

سَحنون سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ اگر امیرالمومنین کو یہ خبر پہنچے کہ فلاں علاقے کے رہنے والوں کو زکوٰۃ وغیرہ کی اشد ضرورت ہے تو اس کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اس صدقے کو جس کا استحقاق کسی دوسرے علاقے والے رکھتے ہیں، اُن کی طرف منتقل کردے کیونکہ جب کوئی ضرورت آپڑے تو اُسے صدقہ و زکوٰۃ کے استحقاق میں مقدم سمجھا جائے گا۔ اور مسلمان مسلمان کا بھائی ہے وہ اُسے بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا نہ اس پر ظلم کرتا ہے۔ (باقی)

سوشلزم اور طالب علم

جناب ریاض الحسن نوری صاحب

انگریزی مقولہ ہے کہ تھوڑا علم خطرناک ہوتا ہے اور اردو میں بھی کہاوت ہے کہ نیم حکیم خطرۂ جان، نیم مُلّا خطرۂ ایمان۔ پس سوشلسٹ نظام کا اصول یہ ہے کہ لوگوں کو معمولی پڑھنا لکھنا اور تھوڑا سا علم سکھا دو۔ اس درجے کے لوگ پروپیگنڈے کی کتابیں پڑھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ پھر حکومت کے لیے ان کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنا آسان ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی تعلیم پر سوشلزم میں زور دیا جاتا ہے کیونکہ بالکل جاہل شخص کو پروپیگنڈے سے متاثر کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اپنے ایک مضمون میں بیسویں صدی کا مشہور ترین فلسفی اور سوشلسٹ برٹرینڈ رسل لکھتا ہے:

"اجتماعی پیداوار اور ابتدائی تعلیم کا یہ اثر پڑا ہے کہ آج انسانی دنیا میں حماقت (STUPIDITY) اس قدر گہرے طور پر چھا گئی ہے کہ جب سے تہذیب کا سورج طلوع ہوا ہے آج تک کبھی بھی حماقت اس قدر عالمگیر نہیں ہوئی۔"

(IN PRAISE OF IDLENESS AND OTHER ESSAYS. P.115)

ل یاد رہے کہ یہ وہی برٹرینڈ رسل ہیں جن کو ہمارے ہاں کے سوشلسٹ حضرات زبردست خراجِ عقیدت پیش کر چکے ہیں۔ بھاشانی صاحب نے بقول پاکستان ٹائمز مؤرخہ ۶ فروری ۷۰ء ان کی بخشش تک کے لیے دعا مانگی تھی۔ پاکستان ٹائمز مورخہ ۵ فروری ۷۰ء میں قصوری صاحب کا خراجِ عقیدت چھپا تھا۔ مشرق ۴ فروری سنہ کے مطابق بھٹو صاحب نے ان کے انتقال کو عظیم نقصان قرار دیا تھا۔ "نصرت" مارچ ۱۹۶۷ء کے رسالے میں ان کی زبردست تعریف ہو چکی ہے۔

"کمیونزم میں تعلیم" کے عنوان کے تحت برٹرینڈ رسل لکھتا ہے:

"۔۔۔ عام تعلیم آج کل (یعنی ۱۹۳۲ء میں) ۸ سال کی عمر سے بارہ سال کی عمر تک کے لیے پرائمری سکول میں دی جاتی ہے ۔۔۔ اسکول میں بچے صرف پڑھائی نہیں کرتے بلکہ بساط کے مطابق جسمانی طور پر کام بھی کرتے ہیں۔ یہ کام وہ بطور تعلیم کے نہیں کرتے بلکہ ایک شہری کے حقوق ادا کرنے کے لیے کرتے ہیں ۔۔۔ گویا کہ بچوں کی مزدوری (CHILD LABOUR) عام مزدوری کے کام کے طور پر ہوتی ہے۔ اور جو کام ان سے کرائے جاتے ہیں ان کا تعیّن تعلیمی نقطۂ نظر سے نہیں کیا جاتا۔" (EDUCATION AND THE SOCIAL ORDSR PP. 107-109)

روس میں نرسری اسکول صرف امیروں یعنی افسران کے بچوں کے لیے ہوتے ہیں۔ ان کے متعلق برٹرینڈ رسل لکھتا ہے:

"مَیں نے نرسری اسکول دیکھے۔ وہاں بچے خوش تھے اور ان کی اچھی نگہداشت کی جاتی تھی لیکن جونہی وہ بولنا سیکھتے ان پر زور شور سے پروپیگنڈا شروع کر دیا جاتا۔" (صفحہ ۱۱۱ محولہ بالا)

نرسری کی تعلیم کی طرح اعلیٰ تعلیم کے اخراجات کا عام مزدور باپ متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے وہ بھی صرف افسروں کی اولاد کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئی ہے۔ آج کل اتنا فرق پڑ گیا ہے کہ ۸ سال کی بجائے ۷ سال کی عمر سے ابتدائی تعلیم روس میں لازمی قرار دے دی گئی ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ ۵ سال کا بچہ کوئی ایسی مزدوری کے قابل نہیں ہوتا جو حکومت کے لیے نفع بخش ہو اور اس سے اسکول کا خرچہ اور استادوں کی تنخواہ دی جا سکے۔ سات یا آٹھ سال کی عمر کے بچے سے نفع بخش پیداواری کام لیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۶۷ء کی روس کے سرکاری پروپیگنڈے کی کتاب بیان کرتی ہے:

"تمام بچے سات سال کی عمر سے اسکول جانا شروع کر دیتے ہیں۔۔۔ ۱۵ یا ۱۶ سال کی عمر تک اسکول جاتے ہیں ۔۔۔ اس دوران بچوں کو سائنس کی مبادیات اور کمیونزم کے نظریے کی تعلیم دی جاتی ہے اس کے علاوہ مزدوری اور ٹیکنیکل ٹریننگ بھی مہیا کی جاتی ہے۔"

(USSR QUESTIONS AND ANSWERS MOSCOW. PP. 344-345)

اس سے معلوم ہوا کہ بچوں کو مفت تعلیم دینے کا دعویٰ ایک فریب ہے۔ اگر حکومت کو مفت تعلیم دینا مقصود ہوتا تو ۵ سال کی عمر سے تعلیم کو شروع کیا جاتا۔ اور ان کے اوّلین ۲ یا ۳ قیمتی سال ضائع نہ کیے جاتے۔ عوام کی ہمدردی کا دعویدار سوشلسٹ نظام سارے ملک کے غریب عوام کے بچوں کے ابتدائی دو یا تین تعلیمی سال محض اس وجہ سے ضائع کر دیتا ہے کہ وہ بچوں کو مفت تعلیم دینا گوارا نہیں کرتا۔ ۷ یا ۸ سال کی عمر میں بچوں کو داخل کیا جاتا ہے۔ کچھ گھنٹے پڑھائی ہوتی ہے۔ باقی وقت مزدوری کی عادت ڈالنے اور ٹریننگ کے بہانے ان سے صنعتی پیداوار کروا کے تعلیم کا خرچہ وصول کر لیا جاتا ہے۔ گویا فیس نقد نہیں مزدوری کی صورت میں وصول کی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ مارکس کے اصولوں ہی کے مطابق کیا جا رہا ہے۔ مارکس نے اپنے مینی فسٹو ہی میں سوشلسٹ پالیسی کا اعلان کر دیا تھا۔ سوشلزم کیا صورت اختیار کرے گا؟ اس کے متعلق مارکس اور اینجلز نے دس نکات بیان کیے ہیں۔ دسویں نکتے میں کہا گیا ہے:

"COMBINATION OF EDUCATION WITH INDUSTRIAL PRODUCTION"

ترجمہ: "تعلیم اور صنعتی پیداوار کو ایک دوسرے کے ساتھ جمع کرنا" (ملاحظہ ہو مینی فسٹو آف دی کمیونسٹ پارٹی۔ طبع ۱۹۶۶ء۔ ماسکو۔ صفحہ ۷۴)۔

اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ کمیونسٹ پالیسی یہ ہے ہی نہیں کہ بچوں کو مفت تعلیم دی جائے، بلکہ ابتداء ہی سے ان کے پیش نظر یہ تھا کہ تعلیم کے ساتھ بچوں سے محنت مزدوری لے کر دولت پیدا کی جائے۔ حالانکہ اکثر سرمایہ دار ملکوں میں ابتدائی تعلیم مفت ہے بلکہ رسل کے بقول امریکہ میں یونیورسٹی تک کی تعلیم مفت ہے۔ سوات کی ریاست میں بقول پاکستان ٹائمز بی۔ اے تک تعلیم مفت ہے۔ سعودی عرب میں تو نہ صرف مفت ہے بلکہ ڈھائی سو یا زیادہ ریال وظیفہ بھی ملتا ہے اور غیر ملکی تعلیم بھی تمام اخراجات کے ساتھ مفت ہے۔ یہی حال کویت کا بھی ہے۔ کسی سرمایہ دار ملک میں بھی بچوں سے مزدوری نہیں لی جاتی۔ پاکستان میں بھی کسی کارپوریشن کے اسکول میں بھی مزدوری نہیں لی جاتی۔

سوشلسٹ نظام میں مزید ایسے قانون نافذ کیے جاتے ہیں تاکہ پندرہ یا سولہ سال کی عمر کے بعد بچہ پڑھائی ترک کر کے مزدوری کا پیشہ اختیار کر لے۔ ان کی تحریص کے لیے یہ قانون بنایا گیا ہے کہ پندرہ یا سولہ

سال کی عمر کا بچہ اپنی آمدنی بغیر والدین کی مداخلت کے جیسے چاہے خرچ کرنے کا مجاز ہے۔ شہروں میں تو ۱۶ سال کی عمر سے ملازمت لازمی ہو جاتی ہے۔ لیکن اجتماعی فارموں کے ممبروں کی اولاد کو قانوناً بارہ برس کی عمر سے کھیت پر کام کرنے کے لیے مجبور کیا جاتا ہے۔ اگرچہ ان کے کام کا کوٹا بڑوں کے کام سے کم ہوتا ہے۔ (ملاحظہ ہو آل یونین انسٹی ٹیوٹ آف جورسٹک سائنسز، منسٹری آف جسٹس، یو ایس ایس آر، ماسکو ۱۹۴۹ء صفحہ ۱۲۳)۔ مزید یہ کہ شہروں میں اگر کوئی پندرہ سال کا لڑکا یا لڑکی نوکری کرنا چاہے تو اس کے لیے والدین کی نہیں بلکہ ٹریڈ یونین کمیٹی کی اجازت لینی پڑتی ہے (دیکھیے :۔ USSR QUESTIONS AND ANSWERS, P.282)۔ پیسے ملنے اور ان کو اپنی مرضی سے خرچ کرنے کی اجازت کی وجہ سے بہت سے بچے پندرہ سال ہی کی عمر میں تعلیم ترک کر کے ملازمت کرنے لگتے ہیں۔ گویا حکومت نے خود اعلیٰ تعلیم کے خلاف محاذ بنایا ہوا ہے۔ حکومت کم علم مزدوروں کو پسند کرتی ہے جو آسانی سے محکوم اور غلام رکھے جا سکتے ہیں۔

چین میں طالب علموں کی حالت | سوشلسٹ نظام چین میں ۱۹۴۹ء میں نافذ ہوا لیکن ۱۹۶۰ء-۱۹۶۲ء کا حال مشہور بائیں بازو کے بین الاقوامی سوشلسٹ مصنف BILL LCKIN سے سنیے۔ آپ لکھتے ہیں :

> "۱۹۶۰-۱۹۶۱ء کے دوران طالب علموں کی بری حالت تھی۔ خوراک کی بے حد قلت تھی۔ مجھے شنگھائی کی طالبہ نے بتایا کہ ۱۹۶۰ء کے دوران اس نے صرف ایک مرتبہ گوشت کھایا... گورنمنٹ نے خوراک کلوری کے حساب سے مقرر کی... بعض یونیورسٹیوں کو احکام صادر کیے گئے کہ طالب علم زیادہ سے زیادہ وقت بستر پر لیٹ کر گزاریں اور اپنی طاقت کو ضائع ہونے سے بچائیں۔ دوسری یونیورسٹیاں بند کر دی گئیں اور طالب علموں کو کمیونوں میں محنت کے لیے بھیج دیا گیا۔" NEW REVOLUTIONARIES. EDITED BY TARIQ ALI, PP. 118-119 -

یاد رہے کہ چین میں چھپکلی، مینڈک وغیرہ بھی گوشت میں شامل ہیں۔ گویا یہ اشیاء بھی اس طالبہ کو سال میں ایک بار سے زیادہ نصیب نہ ہو سکیں۔

روس کی سوشلسٹ حکومت کے سرکاری محققین لکھتے ہیں:

"چین میں کمیونسٹ پارٹی ختم کر دی گئی ہے ..... اس کا صرف نام رہ گیا ہے .... ساری طاقت فوج کے ہاتھ میں ہے۔ یہ لوگ ماؤ کے جی حضوریے ہیں ... فوج ملک کی اقتصادیات اور کلچر کو کنٹرول کرتی ہے ..... نظریہ یہ ہے کہ تمام چینیوں کو تابعدار بیل ہونا چاہیے .... ماؤ صاحب کا کہنا ہے کہ جتنا انسان کا علم بڑھتا ہے وہ اتنا ہی احمق بنتا جاتا ہے[1] ... تمام عجائب گھر اور لائبریریاں بند کر دی گئی ہیں۔ پچھلے چار سالوں میں چین میں کوئی قصہ یا ناول نہیں چھپا ہے .... اس کے ساتھ ساتھ ماؤ کے اقوال اور تصنیفات کی تین سو ادب کا پیاں نشر کی جا چکی ہیں۔ اس عرصے میں، کروڑ سکول جانے کی عمر کے بچے معمولی قسم کی تعلیم سے بھی محروم کر دیئے گئے ہیں ..... ماؤ صاحب کا کہنا ہے کہ اسکول ایسی قبریں ہیں جن سے کہ برائی کے علاوہ کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ ۱۹۶۴ء میں ماؤ صاحب نے فرمایا: سائنس کی تعلیم کو موجودہ مقدار سے نصف کر دینا چاہیے، کنفیوشس صرف چھ چیزیں پڑھایا کرتا تھا: رسمیات، گانا بجانا۔ تیراندازی۔ رتھ چلانا۔ مقدس کتب اور حساب ... اگر تم زیادہ کتابیں پڑھو گے تو شہنشاہ نہیں بن جاؤ گے"... اس کے باوجود چینی حکام اپنے کو مسیحا کہتے ہیں[2]"

---

[1] ماؤ صاحب خود بھی زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ چین سے باہر بھی انہوں نے کوئی تعلیم حاصل نہیں کی ہے۔ اور صرف چینی زبان ہی جانتے ہیں۔ وہ عوام کو صرف اتنا ہی واجبی پڑھانا چاہتے ہیں جس سے وہ ان کے اقوال رٹ سکیں اور ان کے ذہنی غلام بن سکیں۔ وہ تعلیم کو ہرگز عام نہیں کرنا چاہتے کیونکہ عالم لوگ کسی کے ذہنی غلام مشکل ہی سے بنتے ہیں۔

[2] PSEUDO- REVOLUTIONARIES UNMASKED

NOVOSITI PRESS AGENCY, MOSCOW, PP 8-9, 1970

رُوسی ماہرِ تعلیم کی حیران کن شہادت ماسکو سے ۱۹۶۵ء میں رُوس کے مشہور ماہرِ تعلیم A.S. MAKARENKO کی کتاب PROBLMS OF SOVIET SCHOOL EDUCATION شائع ہوئی ہے۔ اِس سے نہ صرف برٹرینڈ رسل کے بیانات کی تصدیق ہوتی ہے بلکہ کئی مزید انکشافات بھی ہوتے ہیں۔ موصوف لکھتے ہیں :

"ہمارے اسکول کو لیبر اسکول کہا جاتا تھا۔۔ ۱۹۲۰ میں ہم ۳۶-۱۹۳۵ء کے DZERZHINSKY کمیون اور اس میں مزدوری (لیبر) پر تاکید کا وہم وگمان بھی نہ کر سکتے تھے۔۔۔۔ گورکی کالونی میں غربت کی عادت ڈالنی پڑی تھی اور مجبوری کی وجہ سے مزدوری کو پروگرام میں شامل کرنا پڑا۔ ۳۱-۱۹۳۰ء میں کمیون میں میرے زیرِ نگرانی بچے گویا ایک سچ مچ کی فیکٹری میں کام کرتے تھے۔۔۔۔ اس زمانے میں ہماری فیکٹری منافع کما رہی تھی۔۔۔ اور آمدنی سے ہر قسم کے اخراجات بھی پورے ہو رہے تھے۔ بلکہ فیکٹری کی مالیت میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔۔۔ البتہ میری زیرِ نگرانی بچوں کو مزدوری نہیں دی جاتی تھی۔ بچوں کو مزدوری دینے یا نہ دینے کا مسئلہ ایک بحث طلب مسئلہ ہے اور آج تک اس بحث کا کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا ہے۔۔۔۔ مَیں اس زمانے میں بچوں کو مزدوری دینے کے خلاف تھا۔۔۔۔ میرا کہنا تھا کہ جب طالب علم بچے بغیر مزدوری کے کام کرتے ہیں تو ان میں زیادہ جوش ہوتا ہے اور پیداوار بھی زیادہ ہوتی ہے۔۔۔۔ میرے گرد ایسے لوگ تھے جو کہتے تھے کہ اگر طالب علموں کو مزدوری دی جائے تو اس سے پیداوار میں اضافہ ہو گا۔۔۔۔ گورکی کالونی میں سخت اقتصادی مجبوری کے تحت ہم کو پیداوار شروع کرنی پڑی۔ یہ زرعی پیداوار تھی۔ بچوں کے کمیونوں میں کاشت کاری سے پیداوار گھاٹے کا سودا ہے[1]۔۔۔۔ دو سال میں مجھے کامیابی حاصل ہوئی۔ غلّہ اگانے میں نہیں بلکہ مویشی پالنے میں۔۔۔۔ اور اس میں نفع ہُوا۔ ہم نے سور پالنے شروع کر دیئے۔۔۔۔ ہمارے پاس دو سو سؤر ہو گئے۔ ہمیں اچھی بلڈنگ میسر تھی۔۔۔۔ منافع کافی ہو رہا تھا۔۔۔۔ بچوں کو جیب خرچ دینے کی اجازت نہ تھی۔ لیکن مَیں

[1] اس لیے کہ ذرا ذرا سے بچے بھلا کھیتی باڑی کہاں کر سکتے ہیں۔ البتہ مویشی چرا سکتے ہیں۔ یہ حالات ایسے ہیں کہ مذکورہ کتاب اگر پروگریس پبلشرز ماسکو کی مطبوعہ نہ ہوتی تو ہم کو بھی اس پر اعتبار نہ آتا۔

ان کو دے دیا کرتا تھا مگر ساتھ ہی تنبیہ کر دیتا کہ وہ کسی سے ذکر نہ کریں۔"

"۔۔۔۔ پھر مجھے DZERZHINSKY کمیون میں تعینات کر دیا گیا۔ بچوں کے اس کمیون کو حکومت ایک دھیلا بھی نہیں دیتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ حکومت نے اس کمیون کی کبھی بھی کچھ مالی امداد نہیں کی۔۔۔۔ کمیون سے ہم بمشکل اتنی آمدنی کر لیا کرتے تھے کہ اپنے کو زندہ رکھ سکیں۔ یہاں حالات گورکی کالونی سے بالکل مختلف تھے۔۔۔۔ یہاں کوئی مشین کام کرنے کے لیے مہیا نہ تھی۔۔۔ کمیون کے ابتدائی سالوں میں چیکا کے ملازم جو یوکرین کے رہنے والے تھے ہمیں اپنی تنخواہوں کا نصف فیصد بطور چندہ دیا کرتے تھے اور اس طرح سے ہمیں تقریباً دو ہزار روبل مل جاتے۔۔۔۔ پہلے تین سال میں نے اور بچوں نے سخت تنگی میں گزارے۔ ایسے دن بھی آجاتے تھے کہ سارا دن ہمیں کھانے کو کچھ نہ میسر آتا۔ صرف سوکھی روٹی مل جاتی۔ آپ لوگ ہماری تنگدستی کا اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مجھے نوکری کے پہلے آٹھ ماہ میں تنخواہ کا ایک حبہ بھی نہ ملا۔ اور مجھے بھی بچوں کے ساتھ محض سوکھی روٹی پہ گذارہ کرنا پڑا[1]۔ ہم پر ایسے مواقع بھی گزرے کہ ہم میں سے کسی کے پاس نقد ایک پائی تک نہ ہوتی اور ہمیں باہر جا کر بھیک مانگنا پڑتی۔ حکومت نے کمیون تو بنا دیا تھا لیکن وہ مالی امداد دینے سے قاصر رہی۔۔۔۔ ہمیں کمائی کرنے کے طریقے خود سوچنے پڑے۔۔۔۔ ہمارے بچوں کی صلاحیت بہت کمزور تھی اور جو کرسیاں اور فرنیچر ہم بناتے اس سے گاہک مطمئن نہ ہوتے اور ہمیں نقصان ہوتا۔ ہم مشکل سے خام اشیاء، بجلی کابل اور گوند وغیرہ کی قیمت پوری کر پاتے۔ جہاں تک ہم لوگوں کا تعلق ہے ہم لوگ بغیر مزدوری کے کام کرتے تھے۔۔۔۔ آخر KOGAN ہمارا گائیڈ بن کر آیا۔۔۔۔ اس نے کہا کہ تعجب ہے کہ ۱۵۰ بچے ہوتے ہوئے تم لوگ اپنی روزی کمانے سے قاصر ہو۔ اس نے ایک بڑا آرڈر لیا۔۔۔۔ آرڈر پورا کرنے کے لیے پچاس ہزار روبل کی ضرورت تھی۔۔۔۔ ہم یہ رقم کہاں سے لاتے۔۔۔۔ KOGAN نے کہا کہ دنیا میں بیوقوفوں کی کمی نہیں ہے۔"

---

[1] سوشلزم میں استادوں کی حالت اور طالب علموں کی درگت دیکھ کر کاش ہمارے ملک کے اساتذہ اور طلبہ نصیحت پکڑیں۔ عقلمند وہی ہے جو دوسروں کے تجربے سے سبق سیکھے۔

"......آخر ہمیں ایک بیز فرت مل گیا۔ جس نے KOGAN کی بات مان لی۔.....۶ ماہ میں ہم نے ۵۰ ہزار کے دو لاکھ بنا لیے...... دو سال میں چھ لاکھ بنا لیے۔ ۱۳-۱۴ سال کے لڑکے لڑکیاں مشین کے آلات پر کام کرنے لگے...."

(دیکھیے صفحات ۱۱۷ تا ۱۲۷۔ کتاب مذکورہ)

مذکورہ بالا سرکاری طور پر شائع کردہ بیان سے ایک طرف تو طالب علموں اور استادوں کی غربت کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ اور دوسری طرف واضح ہوجاتا ہے کہ حکومت کی زیر نگرانی ادارے بھی بعض اوقات تنخواہیں نہیں دیتے۔ مزید یہ کہ نفع کمانے میں یہ ادارے یہودی سرمایہ داروں سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں۔ دو سال میں پچاس ہزار کے ۶ لاکھ اس کے بغیر نہیں بن سکتے تھے کہ بچوں سے بغیر تنخواہ کام خوب لیا جائے اور ان کا خون چوسا جائے۔ دوسری طرف گاہکوں سے بے بہا منافع وصول کیا جاتے۔ اس بیان سے بخوبی واضح ہے کہ سوشلزم میں سرمایہ داری کی خرابیاں اپنے عروج کو پہنچ جاتی ہیں۔ چھوٹے بچوں سے سخت کام لے کر سوکھی روٹی کھلائی جاتی ہے۔ اس حکومت میں اور سرمایہ دار ملکوں کے کارخانہ داروں میں کیا فرق ہے۔ یہ تو ان سے بھی زیادہ ظالم ہیں۔

منافع خوری، سود، لاٹری وغیرہ اور ظالمانہ استحصال آپ نے دیکھ لیا کہ دو سال میں ۵۰ ہزار کے ۶ لاکھ کیسے بنے۔ گویا دو سال میں گیارہ ہزار فیصد منافع کمایا۔ یہ منافع کی وہ مقدار ہے جو شاید بڑے سے بڑے منافع خور سرمایہ دار کو بھی نصیب نہ ہوئی ہوگی۔ آخر اتنا منافع کیونکر ممکن ہوا؟ بچوں سے روکھی روٹی کے عوض جبری محنت لی گئی اور ان کا استحصال کیا گیا۔ گاہکوں کو گھٹیا درجے کا فرنیچر گراں قیمت پر سپلائی کیا گیا اور ان کا استحصال کیا گیا۔ سوشلزم میں یہی ہوتا ہے۔ حکومت ایک عظیم اجارہ دار اور کارخانہ دار بن جاتی ہے۔ فوج اور پولیس کی مدد سے عورتوں، بچوں، عوام، غرض سب کا جی بھر کر استحصال کرتی ہے اور کوئی اُف کرنے والا نہیں ہوتا۔

حکومت دوسروں کے لیے سودی کاروبار کی ممانعت کردیتی ہے لیکن خود سودی کاروبار کرتی ہے لاٹری اور جوئے کا کاروبار بھی کرتی ہے۔ (دیکھیے SOVIET FINANCIAL SYSTEM ۔ مطبوعہ پروگریس پبلشرز ماسکو ۱۹۶۶ء، صفحہ ۲۷۶)

روسی حکومت اپنی رعایا کے ساتھ سودی کاروبار کرنے کے علاوہ غیر ممالک کو بھی سود پر قرضہ دیتی ہے۔

پاکستان ٹائمز مورخہ ۶ ستمبر ۶۹ء کے مطابق روس نے پاکستان کو ۱۹۶۶ء کے قرضے کی شرائط پر مزید قرضہ دینے پر رضامندی ظاہر کی۔ یعنی ۲½ سے ۳ فیصد سود لیا جائے اور دس سال میں قرضہ ادا کر دیا جائے۔ مشرقی یورپ کے سوشلسٹ ممالک کی شرائط بھی یہی ہیں۔ اس کے برعکس پاکستان ٹائمز مورخہ ۳ ستمبر ۶۸ء کے مطابق کینیڈا نے پاکستان کو ۵۵ لاکھ ڈالر کا قرضہ دینے کے کاغذ پر دستخط کر دیئے۔ یہ قرضہ بغیر سود کے ہوگا اور ۵۰ سال کے بعد واجب الادا ہوگا اور مزید ۱۰ سال کی مہلت بھی دی جائے گی۔ یاد رہے کہ کینیڈا ایک سرمایہ دار ملک ہے اور روس سوشلسٹ ہے۔ چین اگرچہ پاکستان کو سیاسی تعلقات کی بنا پر بغیر سود کے قرضہ دیتا ہے لیکن خود اس کے اندرونِ ملک سود کی مقدار کم کر دی گئی ہے لیکن سود کو ختم نہیں کیا گیا ہے۔

غریب بچوں پر اعلیٰ تعلیم کے دروازے بند روس میں کسی مزدور کا لڑکا اعلیٰ تعلیم نہیں حاصل کر سکتا۔ اگر درمیانے طبقے کا کوئی لڑکا قابلیت کی وجہ سے وظیفہ حاصل کر کے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو جائے تو کیا ہوتا ہے۔ پاکستان ٹائمز کا خاص نامہ نگار ماسکو سے رقمطراز ہے:

"کالج کے طالب علموں کی اکثریت غربت کی زندگی بسر کرتی ہے کیونکہ ان کو قلیل رقم مہیا ہوتی ہے۔ ۳۰ یا ۴۰ روبل ملتے ہیں جن سے بمشکل کھانے کا خرچ چل سکتا ہے . . . . افلاس زدہ طرزِ رہائش صحیح خوراک کی کمی اور تفریح کی قلت کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم پوری ہونے تک ان میں سے بہت سوں کی صحت برباد ہو چکی ہوتی ہے۔"

(پاکستان ٹائمز مورخہ ۴ اپریل ۱۹۶۸ء)

ہمارے ملک میں سوشلزم سے متعلق واقفیت بہت سطحی سی ہے۔ قریب قریب سب ہی لوگ محض پروپیگنڈے سے متاثر ہیں۔ خود وہ لوگ جو سوشلزم کے علمبردار اور لیڈر ہیں ان کے مبلغ علم پر بھی بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ مثلاً ہمارے ملک کے سوشلسٹ لیڈر ایک طرف لینن کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں اور دوسری طرف برٹرینڈ رسل کو بھی زبردست عقیدت کا نذرانہ پیش کر دیتے ہیں۔ ان بچاروں کو یہ معلوم نہیں کہ برٹرینڈ رسل لینن کو زار سے بھی زیادہ ظالم قرار دیتا تھا۔ اسی طرح جب کچھ علماء نے سوشلسٹوں کے متعلق کفر کا فتویٰ دیا تو کچھ لوگوں نے چیخ پکار شروع کر دی۔ لیکن کتنے لوگوں کو معلوم ہے کہ خود لینن صاحب اعلان فرما چکے ہیں کہ اصولی اور قانونی طور پر سوشلسٹ

منکرِ خدا ہوتا ہے۔ اوون جو بقول انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا وغیرہ سوشلزم کا بانی تھا نہ صرف منکرِ خدا تھا بلکہ شادی بیاہ کا بھی سخت ترین مخالف تھا اور اس کو ذاتی ملکیت کی قسم سے سمجھتا تھا۔ وہ بچوں کے لیے خاندانی ماحول کا بھی مخالف تھا[1]۔ کفر کے معنی انکار کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں طاغوت سے کفر اختیار کرنے یعنی اس کا انکار کرنے کا حکم دیا ہے۔ کچھ لوگ شیطان کے کافر ہوتے ہیں اور دوسرے خدا کے کافر ہوتے ہیں۔ اسلامی شرع میں نہ صرف خدا کے منکر کو کافر کہا جاتا ہے۔ بلکہ مشرک کو بھی اس لیے کافر کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ قرآن کے بنیادی مسئلہ توحید کا منکر ہوتا ہے۔ کافر ہونے کے لیے قرآن کی ایک آیت بلکہ کسی ایسی حدیث کا انکار بھی کافی ہے جس کی صحت اور عمل پر اجماع ہو چکا ہے۔

ابھی تک کچھ لوگ سوشلزم کو محض ایک اقتصادی نظام کہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی کم علمی واضح ہے لینن نے صاف اعلان کر دیا کہ ہمارا سب سے بڑا کام کفر پھیلانا ہے[2]۔ ماؤ صاحب اپنی لال کتاب کے تیسرے باب میں جس کا عنوان "سوشلزم اور کمیونزم" ہے، لکھتے ہیں کہ "کمیونزم بیک وقت پرولتاریہ کا ایک مکمل نظریاتی نظام اور ایک نیا سماجی نظام بھی ہے۔ یہ کسی بھی دوسرے نظریاتی اور سماجی نظام سے مختلف ہے۔"

اگر کوئی شخص ہمیں آکر کہے کہ نمونیا سے جو بخار چڑھ جائے اس کا علاج ٹمپریچر کو نارمل پر لانا ہے اور اس کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ مریض کو ٹھنڈے پانی سے نہلا دیا جائے۔ اب بجائے اس کے کہ ہم اس سے بحث کریں، ہمیں اس سے کہنا چاہیے کہ جن جن لوگوں نے اس نسخے پر عمل کیا ہے ان کی جو حالت ہوئی ہے وہ ملاحظہ فرمالیں۔ یہ سائنس اور تجربے کا زمانہ ہے۔ جس نسخہ پر عمل کرنے سے فائدہ ہو، اسے استعمال کیا جائے اور جس سے مرض اور بڑھ جائے اس کا نام نہ لیا جائے۔ سوشلزم یہ دکھا چکا ہے کہ اس پر عمل کرنے کے نتائج کیا ہیں۔ اب اس سے بڑا احمق کون ہے جو اسی کو آزمانے کے لیے پھر تیار ہو۔

---

[1] LEGITIMACY VERSUS INDUTRIALISM, P. 168

[2] اس کفر پھیلانے کا اصل مقصد فرعون کی طرح اپنی خدائی قائم کرنا ہے۔

عالمِ اسلام

اُردن اور فلسطین کا المیہ

اور اس کا پس منظر

از جناب خلیل حامدی صاحب

فلسطین کا مسئلہ اب نئے مرحلے میں داخل ہو چکا ہے۔ اب تک جو فریق اس مسئلہ سے وابستہ تھے اُن میں ایک نئے فریق کا اضافہ ہو گیا ہے یعنی فدائین۔ گو اس مسئلے کے اصل فریق فلسطین کے باشندے تھے مگر دنیا کی بڑی طاقتوں نے اور عرب ممالک کی بعض حکومتوں نے اِس اصل فریق کو میدانِ سیاست سے ہٹا رکھا تھا اور اس مسئلے کا حل اپنے منشا کے مطابق کرنا چاہتی تھیں۔ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد فلسطین کے مہاجرین کو اپنے مسئلے سے براہِ راست نمٹنے کا پہلی مرتبہ موقع ملا ہے اور اب انہوں نے مختلف اسباب کی بنا پر اتنی طاقت حاصل کر لی ہے کہ ان کو نظر انداز کر کے کوئی طاقت اس مسئلہ کو حل نہیں کر سکتی۔ یہ بلاشبہ ایک نہایت امید افزا اور خوش کن صورتِ حال ہے۔ مگر اب اسرائیل نواز طاقتوں نے، جن میں مغربی بلاک بھی شامل ہے اور مشرقی بلاک بھی، خود فلسطینیوں کو اپنی سازشوں کا شکار بنانا شروع کر دیا ہے۔ اُردن میں پچھلے عرصہ میں جو خونریز ہنگامے ہوئے ہیں اور شاید آئندہ بھی خونریزی کی نوبت آئے وہ اسرائیل نواز طاقتوں کی سازش ہی کا ایک شاخسانہ ہیں۔ پیشِ نظر تجزیہ کے اندر ان ہنگاموں کے پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ امید ہے کہ اس تجزیہ کے بعد نہ صرف گزشتہ واقعات کو سمجھنے میں مدد ملے گی بلکہ آئندہ مسئلہ فلسطین کے ساتھ جو کچھ گزرنے والی ہے اُس کا بھی اندازہ کرنے میں آسانی رہے گی۔

فلسطین کی آزادی کے لیے جو فلسطینی فدائین کی تنظیمیں کام کر رہی ہیں ان کی تعداد بارہ ہے۔ فدائین

کی سیاسی اور عسکری جنگ کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے ان تنظیموں میں سے ہر ایک تنظیم کا الگ الگ تعارف ضروری ہے۔

۱۔ حرکۃ التحریر الوطنی الفلسطینی (فتح)۔ اس کی قیادت یاسر عرفات کے ہاتھ میں ہے اور اس کا مقصد فلسطین کی آزادی ہے۔ یہ تنظیم بحیثیت تنظیم کسی غیر فلسطینی طاقت کے زیر اثر نہیں ہے۔ اس میں ہر مکتبِ فکر کے لوگ جمع ہیں۔ ایک قلیل تعداد محبِ اسلام عنصر کی بھی ہے۔ چنانچہ اس تنظیم کے زیر انتظام اسلامی تحریک کے تقریباً ۱۲ نمایاں رہنما چھاپہ مار کارروائیوں کے دوران جامِ شہادت نوش کر چکے ہیں جن میں صلاح حسن خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں[۱]۔ عاصفہ فتح ہی کا عسکری بازو ہے۔ یہ کوئی الگ تنظیم نہیں ہے۔

۲۔ الجبہۃ الشعبیۃ لتحریر فلسطین (عوامی محاذ برائے آزادیٔ فلسطین)۔ اس تنظیم کا سربراہ ڈاکٹر جارج حبش ہے۔ یہ بڑا متعصب اور دشمنِ اسلام عیسائی ہے۔ بیروت کی امریکن یونیورسٹی میں اس نے تعلیم پائی ہے۔ عوامی محاذ (پاپولر فرنٹ) کی قیادت سے پہلے یہ عرب قوم پرستوں کی تحریک "القومیون العرب" میں شامل تھا۔ "القومیون العرب" کی تحریک لبنان اور شام کے عیسائیوں نے قائم کر رکھی ہے۔ بیروت کی امریکن یونیورسٹی اس کا مرکز ہے۔ اور اس کا مقصد لادینیت اور قدیم جاہلی تہذیبوں کی بنیاد پر عربوں کو متحد کرنا ہے[۲]۔ آوارہ منش اور اخلاقی اور دینی اقدار سے نفرت کرنے والے نوجوان اس تحریک کا اصل سرمایہ ہیں۔ اس تحریک کے اکثر نوجوان ڈاکٹر جارج حبش کی قیادت میں اب پاپولر فرنٹ میں شامل ہو چکے ہیں۔ پہلے وہ امریکہ کے مقاصد کے تحت کام کر رہے تھے اور اب مارکسزم کا لبادہ اوڑھ کر فلسطین کی تحریکِ آزادی کی روحِ رواں بنے ہوتے ہیں۔ گو وہ مذہب سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کے اندر صلیبی روح کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ جارج حبش اور اس کے ساتھی مارکسزم کے پردے میں عربوں اور مسلمانوں کے اندر تفرقہ اندازی اور ذہنی انتشار پیدا کر رہے ہیں۔

پاپولر فرنٹ اور جارج حبش اب کھلم کھلا اپنے آپ کو مارکسزم کا علمبردار کہتے ہیں۔ پاپولر فرنٹ کے سرکاری

---

[۱] ہفت روزہ المجتمع، کویت، یکم ستمبر ۱۹۷۰ء

[۲] ھذا العالم العربی تالیف نبیہ امین فارس صدر شعبۂ تاریخ امریکن یونیورسٹی بیروت ص ۱۹۷ تا ۲۰۴۔

آرگن ہفت روزہ الھدف (بیروت) نے واضح کر دیا ہے کہ فرنٹ کا نظریۂ انقلاب وہی ہے جو مارکس، انجلز اور لینن نے پیش کیا ہے[1]۔ فرنٹ کی کامیابی کے لیے جارج حبش نے یہ ہدایت جاری کی ہے کہ تنظیم کے اندر برابر نظریاتی جنگ جاری رہنی چاہیے اور نوجوانوں کو مارکس کی تعلیمات کا قائل کرنا چاہیے[2]۔ جارج حبش کی نظر میں عربوں کی شکست کا اصل سبب مذہب کی افیون ہے[3]۔ اس افیون کا نشہ اتارنے کے لیے نوجوانوں کے فرسودہ عقائد پر مسلسل حملے کرتے رہنا چاہیے[4]۔ چھاپہ مار دستوں کے حوصلے بلند رکھنے کے لیے جارج حبش کی ہدایت ہے کہ لڑنے والے نوجوانوں کو مذہبی وعظ سنانے کے بجائے تاریخ کی مارکسی تعبیر کا نظریہ سمجھایا جائے۔ اور انہیں بتایا جائے کہ یہ کشمکش بالآخر ان کے حق میں فیصلہ کرے گی[5]۔ پاپولر فرنٹ کی طرف سے جون ۶۷ء کی شکست کی تیسری سالگرہ کے موقع پر جو بیان جاری ہوا ہے اس میں واضح کیا گیا ہے کہ فلسطین کی تحریکِ آزادی کے تین دشمن ہیں۔ ایک صہیونیت۔ دوسرے استعمار۔ اور تیسرے عربوں کی مذہبی روایات۔ ان تینوں دشمنوں سے نجات پانے کے لیے ترتیب یہ تجویز کی گئی ہے کہ پہلے مذہبی روایات کا قلع قمع کیا جائے اور پھر استعمار کا۔ اس کے نتیجے میں صہیونیت اپنی موت آپ مرجائے گی[6]۔ بیان میں یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ "ہماری جنگ کا میدان صرف اردن اور فلسطین کا علاقہ نہیں ہے بلکہ وہ تمام عرب ممالک ہیں جو قدامت پرستی کے علمبردار ہیں اور سعودی عرب جن میں سرِفہرست ہے۔ قدامت پرستی اور خرافات کی ساری غلاظت سعودی عرب کے مغربی حصہ سے برآمد ہورہی ہے"۔ ظاہر ہے کہ یہ صاف اشارہ مکۂ معظمہ اور مدینۂ منوّرہ کی طرف ہے، کیونکہ سعودی عرب کے مغربی حصہ میں یہی مقامات واقع ہیں۔ پاپولر فرنٹ کی نگاہ میں یہی "خرافات کی غلاظت" کے مرکز ہیں جن کا خاتمہ ہونا چاہیے، لعنۃ اللہ علی الظالمین۔ پاپولر فرنٹ نے اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے دو محاذوں کی طرف اشارہ کیا ہے، ایک اردن کا محاذ اور دوسرا جنوبی عرب کا محاذ۔ یہ دونوں محاذ اسرائیل کا قلع قمع کرنے سے پہلے مکۂ معظمہ اور مدینۂ منورہ کو ختم کرنا چاہتے ہیں[7]۔

---

[1] الھدف ۲ جون ۱۹۷۰ء [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً [5] ایضاً [6] بیان پاپولر فرنٹ مجریہ ۵ جون ۱۹۷۰ء۔

[7] الھدف ۱۲ جون ۱۹۷۰ء۔ ملاحظہ ہو مضمون: ثوار الخلیج العربی المحتل یحددون مھمات المرحلۃ (خلیج عربی کی انقلاب پسند طاقتوں کا موجودہ جنگی منصوبہ)۔

پاپولر فرنٹ خالصتہ مارکسی تحریک کا دعویٰ کرتا ہے۔ چنانچہ فرنٹ کے نوجوان علانیہ مذہب کا مذاق اڑاتے ہیں۔ بیروت کے اخبارات موافف اور الطریق اور الھدف، قاہرہ کا اخبار الطلیعہ، عراق کا اخبار الثقافۃ الجدیدۃ اور شام کا اخبار المعرفہ، یہ سب پاپولر فرنٹ کے نظریات کی حمایت کرتے ہیں۔ یہ اخبارات ہر شمارے میں مذہبی اقدار پر شدید حملے کرتے رہتے ہیں۔ الھدف کے ۱۲ جون کے شمارے میں "حال الدنیا" کے عنوان سے توفیق زیاد کا ایک افسانہ شائع ہوا ہے جس میں قرآن کے اس بیان کا تمسخر اڑایا گیا ہے کہ اللہ نے زمین و آسمان کو چھ روز میں پیدا کیا۔ اور افسانے کی کہانی سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ایک درزی مولوی صاحب کا جُبّہ تین مہینے میں نہیں سی سکا تو "اللہ" نے چھ روز میں کیسے زمین و آسمان کھڑے کر دیئے۔ مولوی کی زبان سے حضرت ابُوذرؓ کو سب سے بُرا شیطان کہا گیا ہے (نقلِ کفر کفر نباشد۔ نعوذ باللہ من ذٰلک الف مرۃ)۔ اسی طرح تفسیر اور حدیث کی تمام کتابوں کا نام لے لے کر ان کی تضحیک کی گئی ہے۔

عوامی محاذ شروع میں ایک ہی قیادت کی نگرانی میں تھا، مگر بعد میں اس میں پھوٹ پڑ گئی اور دو نئے محاذ الگ الگ قیادتوں کے تحت وجود میں آگئے جن کی تفصیل یہ ہے:

۳۔ الجبهة الشعبية الديمقراطيه (ڈیموکریٹک پاپولر فرنٹ)۔ اس کا قائد بھی ایک عیسائی ہے جس کا نام ہے نائف حَواتمہ۔ اس کے مقاصد اور طریقِ کار بھی وہی ہیں جن کا علمبردار جارج حبش ہے۔ مفادات کے اختلاف کی وجہ سے یہ ایک دوسرے سے الگ ہو گئے ہیں۔

۴۔ الجبهة الشعبية لتحرير فلسطين (پاپولر فرنٹ برائے آزادیِ فلسطین) یہ محاذ بھی جارج حبش سے الگ ہونے والوں پر مشتمل ہے۔ اس کا سربراہ احمد جبریل ہے۔ یہ شخص روس نواز کمیونسٹ ہے۔ مصر اور شام کے اتحاد کے زمانے میں شامی فوج میں تھا اور اسرائیل کی جاسوسی کے الزام میں اسے فوج سے نکال دیا گیا تھا۔ اب وہ فدائیین کا نمایاں لیڈر بنا ہوا ہے۔ اِس فرنٹ کے تحت ایک عسکری تنظیم بھی ہے جسے "ہائی کمان" کہا جاتا ہے۔

۵۔ قوات الانصار (الانصار فورسز)۔ یہ تنظیم مکمل طور پر کمیونسٹوں کے ہاتھ میں ہے۔ عراق، شام، لبنان، اُردن اور فلسطین کے کمیونسٹ اس میں جمع ہیں۔ یہ تنظیم اپنے حامیوں میں سے ہر فرد کو ۲۵ اُردنی

دینار ماہانہ امداد دیتی ہے۔ اور یُوں پیسے کے بل بوتے پر کم عمر نوجوانوں کو استعمال کرتی ہے۔

۶۔ قوات التحریر الشعبیۃ (لبریشن پیپلز فورس)۔ اس تنظیم پر بھی کمیونسٹوں کا قبضہ ہے جیش التحریر الفلسطینی (آزادیٔ فلسطین کی فوج) کے نام سے اس نے اپنا فوجی نظام قائم کر رکھا ہے۔

۷۔ صاعقہ فلسطینیوں کی یہ تنظیم شام کی بعث پارٹی کی پروردہ ہے۔ اور بعثیوں اور قوم پرستوں پر مشتمل ہے اور شامی حکومت کے اشاروں پر اپنا نقشۂ عمل تیار کرتی ہے۔ طلائع حرب التحریر الشعبیۃ (عوامی جنگِ آزادی کے دستے) کے نام سے اس کی ایک فوجی تنظیم بھی ہے۔ جمیعان اور یاسر عمر اس کے سربراہ ہیں۔ شام کا سابق وزیراعظم یوسف زعین اس کا سرپرست ہے۔

۸۔ منظمۃ فلسطین العربیہ (فلسطین عرب آرگنائزیشن)۔ یہ عراق کی حکمران پارٹی کی کٹھ پتلی تنظیم ہے اور عراقی حکومت کے مقاصد کے تحت کام کرتی ہے۔

۹۔ الھیئۃ العاملۃ لتحریر فلسطین (ورکنگ باڈی برائے آزادیٔ فلسطین)۔ یہ تنظیم مصر کے تابع ہے ڈاکٹر عصام صرطاوی اس کا سربراہ ہے۔

۱۰۔ جبھتہ التحریر العربیۃ (عرب محاذ آزادی) یہ تنظیم بھی مصر کی آلہ کار ہے۔

۱۱۔ جبھتہ النضال الشعبی الفلسطینی (عوامی جنگی محاذ)۔ اس محاذ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے اسرائیل کی بعض پارٹیوں کی حمایت اور تائید حاصل ہے۔

۱۲۔ الجبھتہ الشعبیۃ (عوامی محاذ)۔ اس کا سربراہ احمد زعرور ہے۔

ان تمام تنظیموں پر آپ نظر ڈالیں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ فتح کے سوا تقریباً تمام تنظیمیں بیرونی طاقتوں کی کٹھ پتلی ہیں، تقریباً تمام تنظیمیں نظریاتی لحاظ سے اشتراکیت اور قومیت کی علمبردار ہیں اور بائیں بازو سے تعلق رکھتی ہیں، اور ہر تنظیم کے اندر کمیونسٹ عنصر گھسا ہوا ہے۔ خود فتح کے اندر بھی اکثریت بائیں بازو سے تعلق رکھتی ہے اور مارکس اور ماؤ کے افکار کی حامی ہے۔

فدائیین نے پچھلے دنوں اُردن کے اندر جو ہنگامے برپا کیے ہیں، وہ محض اتفاقی حادثہ نہ تھے بلکہ ۱۹۷۰ء کا سال طلوع ہوتے ہی اس فتنۂ عظیم کے بھڑک اٹھنے کی پیشین گوئی کر دی گئی تھی۔ خود یاسر عرفات ۱۹۷۰ء کو

"آزمائش کا سال" کہہ چکے تھے۔ بلکہ اسرائیلی اخبارات نے تو راجرز پلان کے فوراً بعد یہ لکھنا شروع کر دیا تھا کہ "اصل اہمیت اِن کارروائیوں کی نہیں ہے جن کا تعلق راجرز پلان سے ہے، بلکہ اصل اہمیت ان حالات کی ہے جو راجرز پلان کے نتیجے میں دنیائے عرب کے اندر واقع ہوں گے[1]"۔ دوسرے لفظوں میں اِن "خصوصی حالات" کو جنم دینے کا منصوبہ پہلے سے تیار کیا گیا تھا اور یہ کہنا غلط ہے کہ المیۂ اردن کا تعلق اس بات سے ہے کہ شاہ حسین نے راجرز پلان کو تسلیم کر لیا تھا اور فدائیین نے اُسے قبول نہیں کیا۔ اب ایک نظر اُس منصوبہ پر ڈالیے جو فدائیین اور شاہ حسین کی باہمی جنگ کے پسِ پردہ کارفرما تھا اور شاید آئندہ بھی اُسے دوبارہ رُوبعمل لایا جائے۔

راجرز منصوبہ کے تحت بظاہر یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اسرائیل جون ۱۹۶۷ء کی جنگ میں حاصل کردہ علاقوں کو خالی کر دے گا۔ مگر کیا اسرائیل اِن علاقوں کو خالی کرنے کے بعد اُسے عربوں کے حوالے کر دیگا؟ اور کیا بڑی طاقتیں (امریکہ اور روس) یہ گوارا کر لیں گی کہ یہ علاقے واپس عربوں کو مل جائیں؟ ان سوالوں کا جواب ہفت روزہ الحدید، بیروت کے نامہ نگار مقیم نیویارک کے مندرجۂ ذیل مراسلے میں دیکھا جا سکتا ہے:

"روسی ذرائع کے مطابق ماسکو نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ ماسکو واشنگٹن کے ساتھ مل کر اُن عرب علاقوں میں مشترکہ فوجیں بھیجنے کے لیے تیار ہے جنہیں عربوں اور اسرائیل کے درمیان غیر مسلح اور غیر جانبدار علاقے قرار دیا جائے گا تاکہ اسرائیل کی سرحدیں دو بڑی طاقتوں کی حفاظت میں ہر لحاظ سے پُرامن رہیں۔ رُوسی نمائندوں نے دو طاقتی مذاکرات کے دوران امریکی حکومت پر یہ واضح کر دیا تھا کہ رُوس اس بات کے لیے تیار ہے کہ اُس نے عربوں کے ساتھ جو وعدے کر رکھے ہیں ان کی شدت کے ساتھ پابندی نہ کرے۔ خاص طور پر یہ وعدہ کہ اسرائیل کو جون ۱۹۶۷ء سے پہلے کی سرحدوں پر واپس لایا جائے۔ اب روسی نمائندوں

---

[1] بحوالہ روزنامہ الحیاۃ، بیروت شمارہ ۲۰ ستمبر ۱۹۷۰ء۔

نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ " پُرامن سرحدوں" سے مراد وہی سرحدیں ہیں جن کا تقاضا نئے حالات کرتے ہیں۔ چنانچہ جولان کی پہاڑیاں جو اسرائیل کے امن کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتی ہیں غیر مسلّح علاقہ ہوں گی۔ اسی طرح وہ تمام علاقے جن کا تحفظ فوجوں سے نہ ہو سکے گا غیر مسلّح قرار دیئے جائیں گے۔ سویز میں اور خلیج عقبہ میں اسرائیل کے لیے جہاز رانی کی آزادی کی ضمانت دی جائیگی۔ امریکی اور روسی فوجیں جو ان علاقوں میں متعیّن کی جائیں گی انہیں یو تھانٹ کی قیادت میں دیا جائے گا۔ اور یو تھانٹ کو یہ اختیار ہو گا کہ وہ ان علاقوں کا تعیّن کر دے جنہیں غیر مسلّح کر دیا جائے یا بین الاقوامی نگرانی میں دے دیا جائے[1]۔"

اور جب بین الاقوامی طور پر " پُرامن حدود" کا تعیّن ہو جائے گا تو اس کے بعد ایک فلسطینی ریاست وجود میں لائی جائے گی جس میں تمام فلسطینی مہاجرین جمع ہو جائیں گے۔ یہ فلسطینی ریاست دریائے اُردن کے مغربی کنارے، اور اردن کے بعض علاقوں اور شام کے بعض شمالی علاقوں پر مشتمل ہو گی۔ اِس ریاست کو غیر مسلّح رکھا جائے گا اور اسے اقوامِ متحدہ کی ٹرسٹی شپ میں دیا جائے گا یہاں تک کہ یہ ترقی کی منزلیں طے کرے[2]۔"

یعنی اسرائیل جو علاقے خالی کرے گا انہیں غیر مسلّح قرار دے کر اُن میں سے بعض علاقوں میں ایک " فلسطینی ریاست" قائم کی جائے گی۔ یہ تھا اصل منصوبہ۔ اِس کے ساتھ ہی سوال یہ پیدا ہُوا کہ اس مجوزہ فلسطینی ریاست کی سربراہی فلسطینیوں کے کس گروہ کے ہاتھ میں ہو گی؟ فتح کی تنظیم اور یاسر عرفات کی قیادت اسرائیل، امریکہ اور روس تینوں کے نقطۂ نظر سے موزوں نہیں ہے، کیونکہ فتح کے اندر اسلام پسندوں کا ایک مضبوط گروہ موجود ہے[3]۔ اسرائیل فتح کو مذہب پسند تنظیم سمجھتا ہے۔ اسرائیل کے اخبار یروشلم پوسٹ کے الفاظ

---

[1] یہ اشارہ بیت المقدس کی طرف ہے جسے اسرائیل، امریکہ اور روس تینوں بین الاقوامی نگرانی میں دینا چاہتے ہیں۔

[2] ملاحظہ ہو ہفت روزہ الجدید، بیروت، شمارہ ۵ اکتوبر ۱۹۷۰ء۔

[3] المجتمع، کویت، یکم ستمبر ۱۹۷۰ء

یہ ہیں :

"فتح کا لفظ قرآن سے ماخوذ ہے اور اس کا مطلب ہے تکلیف اور تنگی کے بعد نصرت اور کشادگی مثلاً قرآن کے اندر وارد ہے کہ "نصرٌ من اللہ و فتح قریب" یہ تنظیم مذہبی احساسات اور جذبات سے مربوط ہے[1]"

فتح کا ایک تصور یہ بھی ہے، جس کی وجہ سے اس کو ناپسند کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے اندرونی نقائص کے باوجود کسی بیرونی طاقت سے سودے بازی کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ مگر دوسری طرف یہ فلسطینیوں کی سب سے مقبول ترین تنظیم ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسری تمام تنظیمیں چھوٹے چھوٹے گروہوں پر مشتمل ہیں اور اخباری پروپگنڈے کے سوا آزادیٔ فلسطین کی کوششوں میں عملاً اُن کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ بین الاقوامی کانفرنسوں میں یاسر عرفات کی متواترہ شرکت نے یاسر عرفات کو غیر معمولی شہرت دے دی ہے اور اُسے فلسطینی اور غیر فلسطینی عرب اپنا نمائندہ تسلیم کرتے ہیں۔ فتح کی "یہ آزادروی" اور یاسر عرفات کی ہر دلعزیز قیادت نہ اسرائیل کو گوارا ہے اور نہ امریکہ اور روس کو۔ چنانچہ یہ تینوں طاقتیں ایک ایسی قیادت کی تلاش میں تھیں جسے وہ اطمینان کے ساتھ مجوزہ فلسطینی ریاست کی زمامِ حکومت سونپ سکیں۔

اس کام کے لیے جارج حبش کو منتخب کیا گیا۔ امریکن یونیورسٹی بیروت کا تعلیم یافتہ یہ شخص مغربی بلاک کو بھی منظور ہے اور اشتراکی بلاک کو بھی۔ جارج حبش، نائف حواتمہ، احمد جبریل اور دوسرے لیڈروں کے اندر باہمی اختلافات خواہ کتنے ہی ہوں، ایک چیز ان سب میں مشترک ہے اور وہ ہے عربوں کو ایک دوسرے سے لڑانے کی خواہش۔ چنانچہ جارج حبش اور اس کے پاپولر فرنٹ کو اچھالنے کے لیے اور فلسطینیوں کے اندر جارج حبش کی قیادت کا سکّہ منوانے کے لیے بین الاقوامی سازش کے تحت جو مختلف حربے اختیار کیے گئے ان میں سے ایک حربہ یہ بھی تھا کہ جارج حبش کے گروہ نے مسافر بردار طیاروں کا اغوا شروع کر دیا اور یہ اغوا شدہ طیارے اردن کے اندر اُتارے جانے لگے۔ فلسطینی نوجوان جو کیمپوں کی زندگی بسر کر رہے تھے اور استعمار کے خلاف جذبات سے بھرے ہوئے تھے، جارج حبش کی اس نئی چال پر عش عش کر اُٹھے اور پاپولر فرنٹ کے گوریلوں کو خوب خوب

---

[1] یروشلم پوسٹ شمارہ ۱۰ مئی ۱۹۶۸ء بحوالہ کتاب "جہاد شعب فلسطین" تالیف صالح مسعود ابوبصیر وزیر خارجہ لیبیا۔

داد دی گئی۔ اس طرح قدرتی طور پر فلسطینی نوجوانوں کی نگاہیں جارج حبش پر گڑ گئیں اور وہ یاسر عرفات کے بجائے جارج حبش کو فلسطین کا نجات دہندہ سمجھنے لگے۔ تمام عرب ممالک نے طیاروں کے اغوا کی مذمت کی۔ یاسر عرفات نے بھی اِس حرکت کو ناپسندیدہ قرار دیا۔[1] مغربی پریس نے طیاروں کے اغوا کی داستانوں کو خوب اُچھالا اور ان گوریلوں کو بڑی اہمیت دی جو طیارے اغوا کر رہے تھے۔ لیلیٰ خالد کو بے مثال ہیروئن بنانے کی کوشش کی گئی۔ بڑے بڑے لمبے مضامین اس پر لکھے گئے۔ حالانکہ اِس لڑکی کی اپنی حیثیت مشکوک ہے اور یہ بات مشہور ہے کہ یہ لڑکی جو امریکن یونیورسٹی بیروت کی تعلیم یافتہ ہے، امریکہ کے ادارۂ جاسوسی کی کارکن ہے۔ امریکی اور یہودی پریس نے اِس کی عظمت اور فدائیت کے جو گُن گائے ہیں وہ اس شُبہ کو مزید تقویت پہنچاتے ہیں۔ اسرائیل کے مشہور اخبار معاریف نے لکھا ہے کہ "لیلیٰ خالد بڑی جانباز لڑکی ہے۔ یہ اپنے مشن کو سرانجام دینے کی غیر معمولی طاقت رکھتی ہے۔ اور مشرق اوسط کے مسئلے میں مؤثر کردار ادا کر سکتی ہے"۔[2] طیاروں کے اغوا پر فلسطین کے فدائیین جس قدر خوشی کے شادیانے بجا رہے تھے دنیا کے اندر اُسی قدر رائے عامہ اُن کے خلاف جذبات کا اظہار کر رہی تھی۔ اُن کے بارے میں جن حلقوں کے اندر ہمدردی کے جذبات اُبھر رہے تھے وہ بھی ان کی مذمت پر اُتر آئے۔

جارج حبش کو فلسطینیوں کا اصل لیڈر بنانے کے لیے عرب ملکوں کے سوشلسٹ اور کمیونسٹ اخبارات نے غیر معمولی کردار ادا کیا ہے۔ ۱۷ ستمبر ۱۹۷۰ء کو امریکہ، روس اور اسرائیل (اور برطانیہ بھی اس میں شامل ہے) نے جارج حبش کے ذریعہ اُس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا آغاز کر دیا جو غیر مسلح فلسطینی ریاست کی تشکیل کے لیے ان طاقتوں نے سوچ رکھا تھا۔ امریکہ کے ادارۂ جاسوسی کی رپورٹ یہ تھی:

"اُردنی حکومت اور فدائیین کا باہمی تصادم دونوں فریقوں کو نڈھال کر کے رکھ دے گا اور دونوں فریق پیشِ نظر منصوبہ کے نفاذ کو نہ روک سکیں گے۔ نیز اُردن کو مکمل مایوسی سے دوچار کر دینے کے بعد دوسرے عرب حکمرانوں کی صفوں کے اندر بھی نا امیدی پیدا ہو جائے گی"۔[3]

---

[1] الحیاۃ۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۷۰ء

[2] معاریف یکم اکتوبر ۱۹۷۰ء۔ اس لڑکی کا تازہ ترین بیان یہ ہے کہ وہ کمیونسٹ ہے اور خدا کو نہیں مانتی ہے۔ اس کے نزدیک حسین اسرائیل سے بھی بڑا دشمن ہے۔

[3] مجلہ الجدید ۵ اکتوبر ۱۹۷۰ء۔

جارج حبش کے پاپولر فرنٹ اور فدائیین کی بائیں بازو کی تنظیموں کے اندر یہ نعرہ پھیلایا گیا کہ "فلسطین کو اگر آزاد کرایا جا سکتا ہے تو صرف اس طرح کہ پہلے عمان کی حکومت کو ختم کر دیا جائے۔"[1] یہ نعرہ سوشلسٹ عناصر کی طرف سے پہلے بھی بارہا لگایا جا چکا تھا، مگر اس مرتبہ اسے مہاجرین کے کیمپوں اور فدائیین کے محاذوں میں پوری قوت کے ساتھ پھیلایا گیا اور فتح کے سوا ہر تنظیم نے اسے خوب ہوا دی۔ بلکہ فتح کے عام کارکن بھی اس نعرے سے مرعوب ہو گئے تھے۔ اس خانہ جنگی کی دلیل یہ پیش کی گئی کہ اردن نے راجرز پلان کو تسلیم کر لیا ہے جبکہ فدائیین کی تمام تنظیموں نے بشمول فتح اسے مسترد کر دیا ہے کیونکہ ان تنظیموں کی نگاہ میں مسئلہ فلسطین کا اصل حل جنگ ہے اور "پرامن حل" فلسطین کے خلاف سازش ہے۔ لیکن جب یہ سوال اٹھا کہ مصر نے بھی تو راجرز پلان کو تسلیم کر لیا ہے پھر مصر کے خلاف خانہ جنگی کا اعلان کیوں نہیں ہوتا؟ تو مصر کی حامی تنظیموں نے اس کا جواب یہ دیا کہ ہم جمال عبدالناصر کی قیادت پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور راجرز پلان کی بھی مخالفت کرتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جمال عبدالناصر کسی خاص مجبوری کی بنا پر اس حل کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ یہ تنظیمیں شاہ حسین کو یہ رعایت دینے کے لیے تیار نہ تھیں۔

فدائیین کی اکثر و بیشتر تنظیمیں عمان میں رہتی ہیں۔ اسرائیل کے خلاف چھاپہ مار کارروائیوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ پروپگنڈا اور اشتہار بازی ان کی کل کائنات ہے۔ ان کے نوجوان مسلح ہو کر جنگی اڈوں میں کارنامے سرانجام دینے کے بجائے شہروں کے بازاروں میں گھومتے پھرتے ہیں اور دوکانداروں سے چندے وصول کرتے ہیں۔ جارج حبش، نائف حواتمہ اور احمد جبریل اور الانصار فورسز کی شہ پر فدائیین کی تنظیموں کے کم سن ارکان نے عمان اور دوسرے شہروں میں یک لخت ہنگامہ آرائی شروع کر دی۔ دکانوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ لوگوں کے گھروں میں گھس کر انہیں مجبور کیا کہ وہ حسین سے بیزاری کا اعلان کریں ورنہ انہیں غداری کے الزام میں قتل کر دیا جائے گا۔ بلکہ بعض مقامات پر بالفعل انہوں نے "غداری" کے الزام میں کئی افراد کو قتل کر ڈالا۔ جارج حبش اور اس کے ساتھیوں کی طرف سے اردنی اور فلسطینی کی عصبیت بھی بھڑکائی گئی۔[2] پاپولر فرنٹ اور دوسری تنظیموں کے نوجوان مسجدوں میں گھس جاتے اور ماؤ کی تصاویر مسجدوں کے اندر آویزاں کرتے۔ ایسے واقعات بھی پیش آئے کہ قرآن کریم کے نسخے انہوں نے زمین پر پھینکے، اسلام کے خلاف نعرے لگائے، اور اشتراکی انقلاب

[1] ماہنامہ فلسطین، بیروت، شمارہ اکتوبر ۱۹۷۰ء۔ [2] الحیاۃ، بیروت ۲۰ ستمبر ۱۹۷۰ء

لانے کے نشہ میں مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو شدید مجروح کیا۔ الغرض اس قدر ملک کے اندر بدامنی ہنگامہ آرائی، لوٹ کھسوٹ، اور دارو گیر کا بازار گرم کیا گیا کہ یہ محسوس ہونے لگا کہ اردن میں کوئی حکومت موجود نہیں ہے[1]۔ کمیونسٹوں نے بعض شہروں میں سُرخ پرچم بھی لہرا دیا اور اُردن کے اندر کمیونسٹ حکومت کے قیام کے خواب دیکھنے لگے۔

اُردن کی فوج اور پولیس نے جو ملک کے اندر شدید انتشار اور بدامنی پر چین بجبیں ہو رہی تھی، شاہ حسین کو حالات پر توجہ دلائی۔ ایک فوجی افسر محمد داؤد نے شاہ حسین کے سامنے اپنے جن جذبات کا اظہار کیا، الحیاۃ بیروت کی رپورٹ کے مطابق وہ یہ ہیں:

"پورا ملک لامتناہی انتشار میں غرق ہے۔ اُردن کا شمالی علاقہ فوج کے قبضے سے نکل چکا ہے اور فلسطین فدائیین کے قبضہ میں نہیں بلکہ انقلاب پسندوں اور مارکسزم کے علمبرداروں کے قبضے میں جا چکا ہے۔ کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کے گروہ چاروں طرف سے وہاں جمع ہو گئے ہیں اور انہوں نے مارکسزم کا جھنڈا لہرا دیا ہے۔ . . . . یہ لوگ تمام معاہدوں کو توڑ چکے ہیں اور اِربد، زرقاء، اَلمفرق، جرش اور خود عمان کے ایک حصہ پر اپنی حکومت قائم کر چکے ہیں۔ قانون اور نظام کی عملداری ختم ہو چکی ہے۔ اور اب ہم فوج کے جذبات کو قابو میں رکھنے سے عاجز ہیں[2]۔"

فتح کی تنظیم ابتداءً اس ہنگامہ آرائی کے خلاف تھی۔ مگر جب دوسری تمام تنظیموں نے حالات کو اپنی منشا کے مطابق ڈھال لیا اور زمامِ کار فتح کے ہاتھ سے نکل گئی تو فتح کے نوجوانوں نے بھی وہی موقف اختیار کر لینے کا فیصلہ کر لیا جو جارج حبش اور احمد جبریل کا تھا یعنی اسرائیل کے خلاف جنگ لڑنے سے پہلے حسین کی حکومت ختم کی جائے۔ اِس طرح فتح بھی اُسی سازش کا شکار ہو گئی جو بیرونی طاقتوں نے تیار کی تھی۔ کمیونسٹوں نے اپنی معروف تکنیک کے مطابق فتح کے نوجوانوں کو استعمال کرنا شروع کر دیا۔ ہنگاموں کی تمام ذمہ داری فتح پر ڈالتے رہے اور شہروں پر پھریرا اپنا لہراتے رہے۔

---

[1] الحیاۃ، بیروت ۲۰ ستمبر ۱۹۷۰ء۔ [2] ایضاً

اس موقع پر جمال عبدالناصر کی طرف سے شاہ حسین کو جو پیغام بھیجا گیا وہ قابلِ مطالعہ ہے۔ یہ پیغام مصر کا چیف آف سٹاف محمد صادق لے کر آیا اور اس پر جمال ناصر کے ساتھ ساتھ لیبیا کے صدر اور سوڈان کے صدر کے بھی دستخط تھے۔ اس تحریری پیغام کے الفاظ یہ ہیں:

"فلسطین کی تحریک مزاحمت کے شریفانہ کردار کو جماعتی مفادات کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔ ہم اس بازاری سیاست میں دخل دینے سے گریز کرتے رہے ہیں، لیکن اب ناگزیر ہو گیا ہے کہ حالات کو قابو میں رکھنے کے لیے اچھے عنصر کی مدد کی جائے۔ ہمارے نزدیک اُردنی قوم اور اردن کے امن اور اُردن کی حکومت کی ذمہ دارانہ حیثیت کا تقاضا ضروری ہے۔ حالیہ ہنگاموں نے مزاحمت کی تحریک ہی کو نقصان نہیں پہنچایا ہے بلکہ پوری عرب قوم کی رسوائی کر دی ہے، عربوں کی شہرت کو خراب کیا ہے اور جنگِ آزادی کے تقدس کو داغدار کیا ہے۔[1]"

اس خط کے صاف معنی یہ تھے کہ ان تینوں عرب سربراہوں کی رائے میں حسین کو فدائیین کے خلاف فوری کارروائی کرنی چاہیے اور "اچھے عنصر" کی مدد کر کے فتنہ پسند عنصر کا قلع قمع کر دینا چاہیے۔ "اچھے عنصر" سے جمال عبدالناصر اور لیبیا اور سوڈان کے سربراہوں کی کیا مُراد تھی، یہ معمّہ حل نہیں ہو سکا۔ کیونکہ اگر اس سے مراد اُردن کی فوج تھی تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس خط کے فوراً بعد لیبیا کی طرف سے اُردن کی مالی امداد کا سلسلہ کیوں بند کر دیا گیا جو تیس ملین اسٹرلنگ پونڈ سالانہ کی مقدار میں وہ جون ۶۷ء کی جنگ کے بعد سے اُردن کو دیتا چلا آرہا تھا۔[2] اور اگر اردنی قوم، اُردن کے امن اور اُردنی حکومت کی ذمّہ دارانہ حیثیت کے تقاضا کا ضامن اُردن کی فوج کے سوا کوئی اور "اچھا عنصر" تھا تو آخر وہ کون تھا؟ بہرحال اب صورتِ معاملہ یہ سامنے آئی کہ ایک طرف مصر، سوڈان اور لیبیا کی طرف سے شاہ حسین کو اُن عناصر کی سرکوبی کا مشورہ دیا گیا جو فلسطین کی تحریکِ مزاحمت کو اپنے جماعتی مفادات کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ دوسری طرف لیبیا نے حسین کو مالی امداد دینا بند کر دی، تیسری طرف شام نے اپنے دو فوجی بریگیڈ اُردن میں داخل کر دیے اور انہیں اپنی پروردہ تنظیم

---

[1] الحیاۃ، بیروت، شمارہ ۲۰ ستمبر ۱۹۷۰ء

[2] "جہاد شعب فلسطین"۔ تالیف سالم مسعود البصیر وزیر خارجہ لیبیا، مطبوعہ بیروت، ص ۵۵۵۔

صاعقہ کے تصرّف میں دے دیا[1] اور چوتھی طرف عراق کی حکومت نے ۱۲ ہزار عراقی فوج کو جو اسرائیل کے مقابلے کے لیے اُردن میں مقیم ہے۔ فدائیین کے تصرف میں دینے کا اعلان کر دیا[2]۔ اِن تمام کارروائیوں کا نتیجہ قدرتی طور پر یہ نکلنا چاہیے تھا کہ حسین کی فوج اور فدائیین دونوں میں شدید تصادم ہو جائے اور دونوں لڑ مر کر اس قدر نڈھال ہو جائیں کہ امریکہ کے ادارۂ جاسوسی کے اندازہ کے مطابق امریکہ اور روس کے لیے فلسطین کے خلاف اپنی سازش بروئے کار لانا آسان ہو جائے تمام عرب سربراہ بھی امریکہ اور روس کی اس سازش کے شکار ہو گئے، کیونکہ ایک طرف انہوں نے خود شاہ حسین کو فدائیین کی سرکوبی پر اکسایا اور دوسری طرف خود ہی فدائیین کی حمایت میں اُردن کے خلاف کھڑے ہو گئے۔ کسی دلیل سے بھی اس دورخی پالیسی کو معقول ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

بہر حال دونوں فریقوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ اردنی اور فلسطینی کے درمیان نفرت و عصبیت کا لاوا پھٹ پڑا۔ دونوں ایک دوسرے کو اُسی طرح اپنا دشمن سمجھنے لگے جس طرح عرب یہودیوں کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ مغربی پریس نے اس خانہ جنگی کو خوب اچھالا اور مبالغہ آمیز خبریں شائع کیں اور اس جنگ کو زیادہ سے زیادہ بڑھانا چاہا۔ برطانیہ کے اخبار گارجین نے لکھا کہ "شاہ حسین کو چاہیے کہ نظامِ سلطنت بحال کرنے کے لیے فوری اور مؤثر اقدام کریں" فرانس کے اخبار نوول آبزرویٹر نے لکھا: "تمام ملک کے اندر جنگ پھیل چکی ہے، عمان ہوٹل توپوں کا نشانہ بنا ہوا ہے اور سینکڑوں صحافی اس ہوٹل کے اندر گھرے ہوئے ہیں، مگر فدائیین کو حوصلے نہ ہارنے چاہییں[3]" شام کی حکومت نے اپنا ریڈیو اسٹیشن فدائیین کے حوالے کر دیا چنانچہ اس جنگ کو بھڑکانے میں شام کے ریڈیو نے غیر معمولی کردار ادا کیا۔ مغربی اخبارات نے شہ سرخیوں سے یہ خبریں

---

[1] شام نے بعد میں اپنی یہ فوج واپس بلا لی۔ اس لیے کہ خود شام کے اندر بعثی حکومت کے خلاف انقلاب کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

[2] عراقی حکومت نے بھی بعد میں عراقی فوج کو احکام جاری کر دیئے کہ وہ اردن کے ہنگاموں میں عملاً کوئی حصہ نہ لے۔ گویا پہلے فدائیین سے فوجی تعاون کا وعدہ کر کے انہیں آسمان پر اٹھا دیا اور پھر جب وقت آیا تو دستِ تعاون کھینچ

[3] بحوالہ "فلسطین" بیروت شمارہ اکتوبر ۱۹۷۰ء۔

چھاپیں کہ اس جنگ میں ۲۵ ہزار افراد مارے گئے ہیں۔ خود یاسر عرفات نے قاہرہ کانفرنس میں یہ بتایا کہ ۲۵ ہزار آدمی مارے گئے ہیں[1]۔ حالانکہ اسی کانفرنس میں شاہ حسین نے بیان کیا کہ مقتولین کی تعداد ۳ ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ پھر تونس کے وزیر خارجہ باہی اُدغم کی قیادت میں عرب سربراہوں کی طرف سے جو تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی گئی تھی اُس نے اُردن کا دورہ کرنے کے بعد یہ رپورٹ دی کہ مقتولین کی تعداد ۱۴سو اور مجروحین کی ۲ ہزار ۳ سو تھی[2]۔

اس خانہ جنگی سے صرف اسرائیل کو فائدہ پہنچا ہے۔ امریکہ، روس اور برطانیہ کی یہ سازش کہ ایک کٹھ پتلی فلسطینی ریاست وجود میں لائی جائے شاہ حسین کی جرأت اور قاہرہ کانفرنس میں غیر سوشلسٹ حکومتوں کے نمایندوں کی حکمتِ عملی کی وجہ سے اس مرحلہ میں وجود میں آنے سے رُک گئی ہے۔ مگر اس کے امکانات ابھی پوری قوت اور شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ اسرائیل کو اس جنگ سے جو فائدہ پہنچا ہے وہ اُس کی توقع سے بھی بڑھ کر ہے۔ فرانس کے مشہور روزنامہ فیگارو کے سیاسی مقالہ نگار، رینے بادوک نے ۱۷ استمبر ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں اس پر جو تبصرہ کیا ہے وہ ملاحظہ کیجیے:

"یہ ماننا پڑے گا کہ پچھلے چند ہفتوں سے گولڈا مائر کو خود عربوں کی طرف سے بھاری بھر کم امداد ملی ہے۔ مصر نے جنگ بندی کے معاہدے کی جو بار بار خلاف ورزی کی، فدائیین نے طیاروں کو اغوا کر کے جس فضائی قزاقی کا ثبوت دیا اور اُردن کے اندر جو خانہ جنگی ہوئی، یہ سب باتیں اسرائیل کی وزیر اعظم کو تقویت پہنچا رہی ہیں۔ گولڈا مائر اب واشنگٹن میں اپنے موقف کو زیادہ قوت کے ساتھ پیش کر سکتی ہے اور وہائٹ ہاؤس سے دو باتیں بآسانی منوا سکتی ہے۔ ایک ۹۰ کروڑ ڈالر کا قرضہ۔ دوسرے راجرز پلان اور سلامتی کونسل کی قرارداد میں یہ تبدیلی کہ جولان کی پہاڑیوں اور تیران پر اسرائیل کا قبضہ رہے اور دریائے اُردن کے مغربی کنارے اور سینا کو غیر مسلح علاقے قرار دے دیا جائے۔"

اس المیہ کے اندر مصر کا موقف عجیب و غریب رہا ہے۔ خانہ جنگی کے آغاز سے پہلے تک شاہ حسین کو

---

[1] الجدید، بیروت ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۰ء - [2] ایضاً

جمال عبد الناصر کی پُوری پوری حمایت حاصل تھی۔ راجرز پلان کو تسلیم کر لینے کے بعد جمال عبد الناصر کی پوزیشن عرب ممالک میں سخت مجروح ہو گئی تھی اور راقم الحروف نے اپنے کانوں سے ان فلسطینیوں کی زبان سے جمال عبد الناصر کے حق میں نازیبا کلمات سُنے ہیں جو ۱۵ سال سے ناصر صاحب کی حمد کی تسبیح پڑھ رہے تھے مگر اس کے باوجود ناصر صاحب اور شاہ حسین کے تعلقات میں کوئی فرق نہ آیا۔ اردن کی خانہ جنگی کے آغاز میں ناصر نے شاہ حسین کی حمایت کا اعلان کیا تھا اور فوجی امداد تک دینے کا وعدہ کر دیا تھا۔ مگر جب فدائیین اور اردنی فوج کے درمیان جنگ چھڑ گئی اور اخبارات اور ریڈیو اسٹیشنوں سے مبالغہ آمیز خبریں نشر ہوئیں تو ناصر صاحب کی طرف سے شاہ حسین کو مذمت کا برقیہ بھیجا گیا[1]۔ اور دونوں کے درمیان یہ کھچاؤ قاہرہ کانفرنس تک قائم رہا۔ ناصر صاحب اس بات پر بھی آمادہ تھے کہ ایک ادھوری فلسطینی ریاست کی تشکیل عمل میں لائی جائے۔ چنانچہ ناصر صاحب نے ایک مرتبہ یاسر عرفات سے دریافت کیا تھا کہ "فلسطین کی آزادی کے لیے کتنی مدت درکار ہے؟ یاسر نے جواب دیا کہ "حقیقت پسندانہ جواب یہ ہے کہ کم از کم بیس سال فلسطین کی آزادی کے لیئے درکار ہیں"۔ اس پر ناصر صاحب نے انہیں کہا کہ "تمہاری کیا رائے ہے اگر میں تمہیں بیس روز کے اندر آدھا فلسطین دلوا دوں؟" نصف فلسطین پر مشتمل فلسطینی ریاست وجود میں لانے کی یہ وہی اسکیم ہے جو امریکہ اور روس تجویز کر چکے ہیں اور اردن کا مغربی کنارہ، شمالی اُردن کا کچھ علاقہ اور شام کا کچھ حصہ اس کے لیے مخصوص کرنا چاہتے ہیں۔

عراق اُردن کا شدید مخالف رہا ہے۔ عراق نے فوراً اعلان کیا کہ عراقی فوجیں فدائیین کے تصرّف میں دے دی جائیں گی۔ مگر اس اعلان کو عراق نے عملی جامہ نہیں پہنایا۔ عراق کا یہ رویّہ بلاشبہ انتہائی معنی خیز ہے لیکن جو شخص عراق کی موجودہ سیاست پر گہری نظر رکھتا ہے اُس کے لیے اس صورتِ حال کو سمجھنا دشوار نہیں ہے عراق کی حکمران بعث پارٹی جو بعث کی بین العرب کمانڈ کی حامی ہے اور مشہور عیسائی لیڈر میشل عفلق کی رہنمائی میں چل رہی ہے ایک طرف اشتراکیت کی علمبردار ہے اور دوسری طرف وہ انگریزی سامراج کے ساتھ گہرا رشتہ ناطہ رکھتی ہے۔ خود مصری سربراہ جمال عبد الناصر نے عراقی بعث پارٹی کے بارے میں جو رائے قائم کی ہے وہ

---

[1] الجدید، بیروت، شمارہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۷۰ء

یہ ہے:

"مصری سربراہ (جمال عبدالناصر) نے عراق کی حکمران بعث پارٹی پر بھی تنقید کرتے ہوئے کہا کہ قاہرہ کے پاس ایسے پختہ ثبوت موجود ہیں کہ عراق کے بعثی لیڈروں نے جو موقف اختیار کر رکھا ہے اُس کے پسِ پردہ بین الاقوامی امپیریلزم کا ہاتھ کام کر رہا ہے۔ اور بین الاقوامی امپیریلزم نے عراق کے ذریعہ سے مسائل پیدا کر دیئے ہیں جن کا ہماری موجودہ جنگ سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔ امپیریلزم بعثیوں کے اس موقف سے فوجی، سیاسی اور اقتصادی فوائد حاصل کر رہا ہے[1]"

صدر ناصر نے مشرقی محاذ پر عراقی فوجوں کے کردار کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ عراقی فوجوں کی وطنیت پسندی میں کوئی شبہ نہیں ہے مگر عراقی رہنما نہیں چاہتے کہ یہ فوج کوئی مؤثر کردار ادا کرے۔ صدر ناصر نے ان اختلافات کے بارے میں جو عراق کے اندر مختلف عناصر کے مابین جاری ہیں بتایا کہ بعث پارٹی نے مصنوعی طور پر اختلافات پیدا کر رکھے ہیں۔ ان اختلافات کا تعلق بنیادی مسائل سے بالکل نہیں ہے۔ بلکہ بعثی لیڈر ضمنی مسائل چھیڑ کر عراقی فوج کے مشکوک موقف پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں[2]

---

[1] یہ اقتباس جمال عبدالناصر کی اس تقریر میں سے لیا گیا ہے جو انہوں نے سوڈان کے وکلا اور ججوں پر مشتمل ایک وفد کے سامنے قاہرہ میں کی ہے۔ ملاحظہ ہو الاہرام ۱۰ ستمبر ۱۹۷۰ء۔ [2] ایضاً

(بقیہ اشارات)

مولانا محترم کو سرپرستی کے مقام پر فائز کرنے اور اُن کی جگہ زندگی سے بھرپور کسی نئی امارت کو سامنے لانے میں جس قسم کے غلط تاثرات شامل ہیں ان کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ بعض لوگ یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ امریکہ میں کینیڈی کی کامیابی کی وجہ ٹیلیویژن پر اس کے حسن اور توانائی کی نمائش تھی۔ اوّل تو یہ بات ہی غلط ہے۔ اگر انتخابات میں کامیابی کا راز صرف اس بات میں مضمر ہوتا تو پھر دنیا کی زمام کار اداکاروں کے ہاتھ میں

ہوتی۔ دوسرے امریکہ کی صدارت کے لیے انتخابی جدوجہد اور احیائے اسلام کے لیے تگ و دو میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اُس انتخابی جدوجہد کا مقصد جذباتی فضا تیار کر کے زیادہ سے زیادہ ووٹ حاصل کرنا ہے اور یہاں سارا معاملہ حکمت و دانائی کے ساتھ اسلام کو دنیا میں ایک غالب قوت بنانے کا ہے۔ جو چیز وہاں ہنر ہے یہاں وہ عیب ہے۔ وہاں جذبات میں ہیجان پیدا کرنا ایک خوبی ہے اور یہاں اس کی حیثیت ایک بُرائی کی سی ہے۔ تحریکِ اسلامی کو ترقی دینے میں بلاشبہ جذبات کا بھی ایک حصہ ہے مگر یہاں زمام کار ایک ایسے صاحب بصیرت کے ہاتھ میں دینے کی ضرورت ہے جو جذبات کے اندر توازن پیدا کرے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ کام جذبات میں اشتعال پیدا کرنے سے تو سرانجام نہیں دیا جا سکتا بلکہ اُن کے اندر ضبط پیدا کرنے سے کیا جا سکتا ہے لہٰذا اسلامی تحریک کا کوئی قائد اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ وہ اسٹیج پر تھرک کر اپنے اردگرد جذبات کا ایک ہالہ قائم کرے۔ وہ تو ہر مرحلے پر تہذیب و شائستگی کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ وہ زبان کے استعمال کے معاملے میں مطلق العنان نہیں ہو سکتا بلکہ ہر لفظ کو شعور اور عقل کی معتدل میزان پر تول کر کہنے کا عادی ہوتا ہے۔ وہ عوام کے جذبات سے نہیں کھیل سکتا بلکہ انہیں عقل کی بات سمجھاتا ہے اور دنیا میں سستی شہرت کے حصول کے بجائے آخرت میں فلاح و کامرانی حاصل کرنے کے لیے تگ و دو کرتا ہے۔ جس طرح ملتِ اسلامیہ کو اقوامِ مغرب پر قیاس کرنا غلط ہے بالکل اسی طرح اس ملت کے قائدین کو مغربی قوموں کے قائدین کے معیار پر دیکھنا غلط ہے۔ آپ ان قائدین سے یہ مطالبہ تو کر سکتے ہیں کہ وہ ہمارے نامور اسلاف کا نمونہ بنیں مگر انہیں کینیڈی، ماؤ، ڈیگال، سٹالن، خروشچیف اور چرچل کے نمونے بنانا سخت ناانصافی ہے۔

باقی رہا مولانا کی زیرنگرانی نئی قیادت کی تربیت کا مسئلہ تو مولانا خود اس کے لیے فکرمند ہیں اور اس کام کے لیے اہل افراد کو تیار کرنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ اس ایک فطری طریقِ کار کو چھوڑ کر اگر کوئی دوسرا طریقہ اختیار کیا گیا تو اس سے اس تحریک کو فائدہ پہنچنے کے بجائے نقصان پہنچے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح فہم عطا کرے اور اس بات کی توفیق دے کہ ہم اس تحریک کے مزاج کو سمجھنے کے قابل ہوں۔

لیل و نہار

نئی شان نئے انداز میں

۱۹۷۱ء کی منفرد ڈائری

نفیس طباعت ــــــ وسیع معلومات

بہترین تحفہ

- احادیث، اشعار اور اقوال سے مزین
- یادداشت بھی اور اصلاح و تربیت کا سامان بھی
- تاجروں، صحافیوں، طلباء اور وکیلوں کیلئے سود مند
- سائز ۱۸ × ۲۳ / ۸ قیمت صرف -/۹ روپے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ

۱۳۔ ای شاہ عالم مارکٹ لاہور (مغربی پاکستان)، فون نمبر ۶۸۳۴۱

شاخ: ۱۶۔ بیت المکرم (پہلی منزل) ڈھاکہ (مشرقی پاکستان)، فون نمبر ۲۸۳۸۷۹